وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ﴿القرآن﴾

محاضرات بين الفِرق والأديان

تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ

مختلف ادوار میں پائے جانے والے
"جدت پسند اور مغرب زدہ دانشوروں"
(خصوصاً جاوید احمد غامدی) کا علمی محاسبہ

تالیف

مولانا کمال الدین المسترشد
خادم الاحادیث النبویہ جامعہ مخزن العلوم

مکتبۃ الإمام محمدؒ
دکان نمبر ۳ اسلام کتب مارکیٹ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
0300-2714245, 0346-3086582

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه“ (القرآن)

محاضرات بین الفرق والادیان

تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ

مولانا کمال الدین المسترشد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم:۔

دین اسلام کی مثال اس درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں انتہائی گہرائی میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں' شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں اور اس کے ساتھ وہ پوری دنیا پر سایہ فگن ہوں، وہ ہر وقت تازہ اور پھلدار رہتا ہو۔

ایسے میں کوئی امکان نہیں کہ اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کامیاب ہو جائے یا خود بخود یکدم سے گر کر وہ شجر نیست و نابود ہو جائے۔

جو آدمی اس کو گرانے کیلئے دوڑ کر اپنا سر و سینہ اس سے ٹکرائے گا وہ خود پاش پاش ہو جائے گا یا پھر ایسا زخم کھائے گا جو عرصہ تک مندمل نہ ہو گا' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی احمقانہ جذبات کا حامل شخص اس شجرۂ طیبہ کی کوئی ٹہنی توڑ دے یا کوئی شاخ کاٹ دے یا پھر باہر سے کوئی دیمک لا کر اس کے جسد مطہر پر بٹھا دے۔

اسلام کے دوست و دشمن:

اسلام کے خیر خواہوں اور بد خواہوں کی کوئی کمی نہیں دونوں فریق کی لمبی لمبی فہرستیں ہیں اگر آپ اس کے حامی و ناصر لوگوں کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں تو آپ کو ہر شعبہ کو بام عروج پر پہنچانے والوں کی کثیر تعداد ملے گی' آپ مجاہدین کو لیجئے تو ان کی شجاعت' ہمت اور طاقت کی نظیر پیش کرنے سے دوسرے مذاہب والے قاصر ہیں' آپ مساجد بنانے والوں اور مدارس قائم

کرنے والوں کو لے لیں تو آپ کو پوری دنیا پر پھیلا ہوا ایک وسیع ترین جال بچھا ہوا نظر آئے گا۔ آپ خانقاہوں کی مثال دوسرے مذاہب میں ڈھونڈنا چاہیں گے تو آپ کو نہیں مل سکتی آپ نماز پڑھنے' روزہ رکھنے' زکوٰۃ دینے اور حج کرنے والوں کی تعداد اور نظیر باقی ادیان میں تلاش کریں گے تو کہیں بھی اس میں کامیابی نہیں ملے گی اور اگر آپ علماء کرام کی خدمات ان کی درس و تدریس اور تالیف و تصنیف یا مواعظ و نصائح کے کارناموں پر نظر ڈالیں گے تو یوں لگے گا کہ انہوں نے ایک ناممکن شے کو ممکن بنا کر پیش کیا ہے' جبکہ حفاظ حدیث آئمہ' مجتہدین' فقہائے کرام اور مفسرین وغیرہ تو اپنی مثال آپ ہیں۔

الحمدللہ یہ تمام شعبے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے پوری آب و تاب کے ساتھ فعال ہیں اور ان میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کے برعکس جب ہم دوسری جانب نظر دوڑاتے ہیں اور اسلام کے مخالفین کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے یوں سمجھنا چاہئے جیسے کھیل کے میدان میں دو ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں اور ہر فریق اپنی جیت کی بھرپور کوشش کرتا ہے یا جیسے میدان جنگ میں دو مخالف لشکر ایک دوسرے کو ہرانے کی سر توڑ سعی میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کو نقصان پہنچانا ایک شیطانی حرکت ہے کہ اسلام انسانوں کی فلاح و کامرانی کا ضامن مذہب ہے اس کو گرانے کی کوشش کا مطلب انسانیت کو پھر سے وادیٔ ظلمت اور دور جاہلیت میں دھکیلنے کی نامبارک سعی ہے اختصار کے پیش نظر ہم ان اقدامات کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتے جن سے اسلام کو غیر معمولی نقصان تو پہنچا ہے مگر ان کی بنیاد کسی سازش یا

منصوبہ بندی پر قائم نہ تھی بلکہ ذاتی انتقام یا لاعلمی اور افراط و تفریط پر مبنی تھی' بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل سے ناقابل تلافی نقصان ہوا لیکن وہ قتل کسی منظم سازش کے تحت نہ ہونے کی وجہ سے تفریق بین المسلمین کا سبب نہ بن سکا' اس کے بر خلاف بعض صوفیائے کرام جو بغیر علم کے عمل کے شوق میں حدود سے گزرے ان کے بعض اقدامات تفریق کا سبب ضرور بنے مگر وہ کوئی سازش کرنا نہیں چاہتے تھے وہ صرف فرط محبت کی بناء پر کام بگاڑ چکے جیسا ایک دوست دوسرے دوست سے گلے ملتے وقت اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے اور اتنی شدت سے اپنے دوست کو دبائے کہ اس کی پسلیاں توڑ دے' اس لئے یہ دونوں فریق موضوع بحث میں داخل نہیں ہیں۔

چونکہ اصل موضوع تو جناب غامدی صاحب کی نرالی تحقیقات ہیں بنابریں ان لوگوں کا تذکرہ جو اسلام کو نقصان پہنچا چکے ہیں یا اس میں مصروف عمل ہیں انتہائی مختصر انداز میں پیش ہے۔

یہودی سازشیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل یہود آپ علیہ السلام کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہے تھے وہ آپ علیہ السلام پر ایمان لانے کیلئے بظاہر بالکل تیار بیٹھے تھے لیکن ان کے آباو اجداد کی ہوس پرستی' حسد' کینہ اور استکبار عن الحق کی بیماری ان کی رگ رگ میں رچ بس گئی تھی یہ ایک موروثی مرض تھا جس سے وہ خود کو پاک کرنے' دور رکھنے اور علاج کروانے کی کوشش

نہیں کرتے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب نبوت کے عطا ہونے کا اعلان فرمایا اور یہود کو اس کی اطلاع ہوئی تو بجائے لبیک کہنے کے انہوں نے لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ صاف منکر بن گئے' یہ انکار محض عناد اور بے جا ضد پر مبنی تھا کیونکہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوصاف جو توراۃ میں مذکور تھے ان کے مشاہدہ میں آچکے تھے' دوسری جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا بہت خیال فرماتے تاکہ ان کے قلوب کی تالیف کی جاسکے انہوں نے ایسے امور میں ان کا ساتھ دینا عملی طور پر پسند فرمایا جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل نہ ہوئی تھی اور جو عربوں کی روایات کے خلاف تھے مگر ان لوگوں کا مذہبی مزاج اور شعور اتنا بگڑ چکا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف بن گئے بلکہ آپ کی دشمنی میں مشرکین عرب سے بھی سو قدم آگے نکل گئے' انہوں نے عربوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر اکسایا اور آپؐ کے کتب سابقہ میں بیان شدہ اوصاف میں تبدیلی کر دی اور مکر و فریب کا ہر حربہ استعمال کیا حالانکہ یہ شرارت ان کیلئے سیاسی و اقتصادی اعتبار سے بھی نقصان دہ تھی اگر وہ عقلمندی اور ہوشیاری سے کام لیتے اور مکاری کو بالائے طاق رکھ کر آپؐ کی تصدیق کرتے تو وہ بجائے غلام کے آقا بن جاتے' لیکن غلامانہ زندگی بسر کرنے والی قوم ہمیشہ گھٹیا فیصلے کرتی ہے کیونکہ غلامی کا لازمی اثر ہے کہ مکاری آدمی کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔

قصہ مختصر:۔ یہود نے مخالفت کا کوئی ایسا راستہ نہ چھوڑا جس پر انہوں نے دشمنی کے گھوڑے نہ دوڑائے ہوں وہ ان تمام حربوں میں پس پردہ رہنے کی

کوشش کرتے اللہ نے ان کے سب حیلوں اور تدبیروں کو ناکام بنادیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین متین مکمل ہوا اور جزیرۃ العرب سے ان لوگوں کا رسوا کن خاتمہ ہوا۔

چونکہ یہود میں مُتَنَوِّع صفات جمع ہو گئی تھیں ایک طرف تکبر' غرور اور حب جاہ و دولت جبکہ دوسری جانب ذلت' رسوائی اور دھوکہ و مکر وفریب جیسی خسیس خامیاں انکی طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں کہ وہ علم کے بہت بڑے سرمایہ کے مالک بھی تھے جس کے غلط استعمال سے ان میں پہلی قسم کے عیوب نے جگہ بنالی تھی اور وہ غلامی کے کئی ادوار سے بھی گزر کر جلاوطنی کے ایام کاٹ رہے تھے جس سے دوسری نوع کی مذموم خصلتوں نے جنم لیا تھا' ان متضاد عیوب کی بناء پر وہ کھل کر کوئی لائحہ عمل کا اعلان نہ کرسکے تاہم اپنی غلامانہ ذہنیت کی بنا پر انہوں نے مکاری کا راستہ اپنالیا تھا چنانچہ اولاً انہوں نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت سے لوگوں کو یہ کہہ کر بدظن کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے پاس جس نبی کے احوال مکتوب ہیں محمد عربی میں وہ نہیں پائے جاتے ہیں' جب یہ حربہ ناکام ہوا تو عربوں کو ان کے خلاف جنگ وجدال پر اکسایا اور اس مخالفت میں یہاں تک گئے کہ ان کے شرک کو اسلام کے مقابلے میں بہتر قرار دیا جس کے نتیجہ میں غزوۂ احزاب وخندق کی نوبت آئی جب اس میں بھی نامراد ہوئے تو آپ پر سحر کرنے اور آپؐ کو زہر کھلانے کی بزدلانہ حرکت کی لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اسلام اپنی پوری رفتار سے ترقی کرتا ہوا اور ان کی تمام رکاوٹوں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ بلاد عجب کی ناقابل تسخیر حکومتوں کو بھی مسخر کرنے میں کامیاب ہوا مگر یہود پھر بھی منقاد نہ ہوئے اور

اپنے عناد پر بضد رہے۔

عبداللہ بن سبا کا ظہور:

اب یہود کے سامنے صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان تفریق ڈالیں کہ یہ واحد صورت تھی جس سے مسلمانوں کی طاقت کم اور وحدت و قوت منقسم ہو سکتی تھی چنانچہ ابن سودا نے اس کا بیڑا اٹھانے کا تہیہ کیا جس کا قصہ مشہور مؤرخ ابن خلدون نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''مفسدہ پردازوں میں نمایاں عبداللہ بن سبا معروف بہ ابن السوداء تھا جو اس سے پیشتر یہودی مذہب رکھتا تھا اور زمانۂ خلافت امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ میں مدینہ آ کر بطمع مال و زر ایمان لایا مگر سچا و پکا دین دار نہ ہوا اہل بیت کی محبت کی آڑ میں لوگوں کو امیر المؤمنین عثمان اور شیخین رضی اللہ عنھم کے خلاف اکساتا اور ان حضرات کے خلاف بہتان تراشتا' اہل بصرہ اس خباثت سے مطلع ہوئے تو انہوں نے عبداللہ کو نکال باہر کیا' کوفہ پہنچا جب وہاں سے بھی شہر بدر کیا گیا' شام پہنچا اور شام سے شہر بدر ہو کر مصر پہنچا' امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اکثر طعن و تشنیع کرتا اور خفیہ طور سے اہل بیت کی دعوت دیتا اور کہتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر واپس آئیں گے جیسا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام واپس آئیں گے اور علی بن ابی طالب وصی رسول اللہ ہیں عثمان اور ان کے پہلے ابو بکر اور عمر نے جبراً و غصباً بغیر کسی استحقاق کے خلافت حاصل کی' غرض لوگوں کو اسی قسم کی تعلیمات دیتا اور امیر المؤمنین حضرت عثمان اور ان کے عمال کے خلاف برانگیختہ کرتا یہاں تک کہ بعض شہروں میں اکثر عوام الناس ان باتوں

کی طرف مائل ہو گئے اور باہم اس کی بابت خط و کتابت ہونے لگی اسی گروہ کے ساتھ خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر تھا''

(تاریخ ابن خلدون ج ا ص ۴۲۹ مترجم نفیس اکیڈمی)

مصر میں پہنچ کر اپنے احباب سے جو بصرہ و کوفہ میں تھے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح پوشیدہ پوشیدہ امراء و عمالِ امیر المؤمنین عثمان پر طعن و تشنیع کو عام کرنے لگا (ایضاً ص ۴۳۵)

اس اثنا میں عبداللہ بن سبا کے مقلدین کل ممالک اسلامیہ میں منتشر ہو گئے چاروں طرف اعلانیہ طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا روزانہ اس کی خبریں مدینہ میں پہنچنے لگیں مدینہ میں بھی سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ (ایضاً۴۳۹)

(غرض) مراسلات کے ذریعہ طے کیا کہ فلاں روز آئندہ موسم حج میں مدینہ منورہ میں آ جانا چاہئے چنانچہ مصر' کوفہ اور بصرہ سے ایک ایک ہزار باغی ماہ شوال میں مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ (ایضاً ۴۴۵)

(القصہ یہ سمجھانے سے بھی باز نہ آئے) حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا بعد ازاں کمینوں کا ایک گروہ پہنچا ان کمینوں میں سے ایک نے آپ پر تلوار چلائی نائلہ بنت الفراضہ ؓ (حضرت عثمان کی بیوی) نے ہاتھ سے روکا' انگلیاں کٹ گئیں دوسرے نے وار کیا خون کا قطرہ مصحف کریم پر گرا آپ ؓ شہید ہو گئے' (خون کا قطرہ مصحف کریم کی آیت ''**فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم**) پر گرا تھا یہ قرآن مسجد نبوی کے کتب خانہ میں تھا اس کو مصحف امام سے تعبیر کرتے تھے کہتے ہیں سُنا ہے کہ زمانہ جنگ عظیم یورپ میں لندن کے میوزیم میں پہنچ گیا'' محشی) بلوائیوں نے گھر میں جو کچھ پایا لوٹ لیا عورتوں کے

کپڑے اور زیورات تک چھین لئے بیت المال کی طرف گئے اور اس کو تاراج کیا بلوائیوں میں سے ایک نے امیر المؤمنین کا سر اتارنے کا قصد کیا عورتوں نے شور مچایا ابن عدیس نے کہا جانے دو اس کے سر سے ہم کو کوئی سروکار نہیں ہے۔(ایضاص ۴۵۸)

عبداللہ بن سبا یہودی کی اس سازش کے نتیجے میں شجرہ اسلام کی جڑیں ہل گئیں اہل اسلام واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئے بڑا انتشار رونما ہوا وحدت اسلامی پارہ پارہ ہو گئی باہمی اتحاد و قوت کا رخ بیرون دشمنوں کی بجائے خیمۂ اسلام کے اندر کی جانب مُڑ گیا اخوت کی بے مثال محبت کو نفرت کی دیمک لگ گئی، شجرۂ طیبہ کے ٹھنڈے سایہ میں باہمی جھگڑوں کی لوُ داخل ہو گئی، بے نظیر امن کا دامن اور سایۂ عاطفت سمٹنے لگا مگر ابن سودا یہودی کا سینہ جو آتش انتقام سے بھرا ہوا تھا بدستور شعلہ زن رہا وہ چاہتا تھا کہ مزید ایسے نامبارک کارنامے سرانجام دے جن سے مستقل باہمی لڑائیوں اور عقائد کی جنگ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو چنانچہ غزوۂ جمل میں جب فریقین غلط فہمیوں کو دور کرکے صلح کرنے پر متفق ہو گئے تو سبائی ٹولے کی شیطانی رگ پھر سے پھڑکنے لگی اور سازشوں کیلئے دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھ گیا۔

عبداللہ بن سبا یہودی کی ایک اور خطرناک سازش:

تاریخ ابن خلدون میں اس صلح کی پوری تفصیل کے بعد لکھا ہے ”القصہ امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) نے لشکریوں کو جمع کرکے خطبہ دیا اور اگلے دن

کوچ کرنے کا حکم صادر فرمایا اور ان لوگوں کی نسبت جو محاصرہ عثمان میں شریک تھے یہ حکم دیا کہ وہ ہمارے گروہ سے نکل جائیں ہمارے ساتھ نہ چلیں''

اہل مصر کو یہ مصالحت ناگوار گزری ابن السوداء (عبداللہ بن سبا) خالد بن ملجم اشتر مع اُن لوگوں کے جنہوں نے عثمان بن عفان کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا اور بغاوت کی تھی ایک مقام پر جمع ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے...... ابن السوداء نے کہا اے بھائیو! تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ لوگوں میں مل جل کر انہیں لڑا دو میرے نزدیک بہتر ہو گا کہ کل جب فریقین جمع ہوں تو جس طرح ممکن ہو کسی حکمت سے لڑائی چھیڑ دو لڑائی شروع ہو جانے پر تم سے وہ لوگ غافل ہو جائیں گے اور تم لوگ جس مکروہ سے ڈرتے ہو محفوظ رہو گے۔

(تاریخ ابن خلدون ص ۴۹۵ ج ۱)

چنانچہ علی الصباح فریقین کی لاعلمی میں فتنہ پردازوں نے لڑائی کا رنگ جما دیا بلوائیانِ مضر نے مضر پر فتنہ پردازان ربیعہ نے ربیعہ پر باغیان یمن نے یمن پر اور اہل بصرہ نے اہل بصرہ پر غرض ہر قبیلہ اپنے اپنے قبیلے پر حملہ آور ہوا' ادھر طلحہ اور زبیر نے لڑائی کا شور و غل سن کر عبدالرحمان بن حرث کو میمنہ پر ' عبدالرحمن بن عتاب کو میسرہ پر متعین کیا خود قلب لشکر میں رہے لوگوں نے لڑائی چھڑنے اور شور و غوغہ کی وجہ دریافت کی معلوم ہوا کہ اہل کوفہ (لشکر علی رضی اللہ عنہ) نے پو پھٹتے ہی تیر اندازی شروع کر دی طلحہ و زبیر نے کہا افسوس علی (رضی اللہ عنہ) خون ریزی کئے بغیر نہ مانیں گے یہ کہہ کر حملہ آور گروہ کی مدافعت کرنے لگے۔

ادھر امیر المؤمنین حضرت علیؓ شوروغل سن کر خیمے سے باہر تشریف لائے حال دریافت کیا' فرقہ سبیہ کے ایک شخص نے جس کو فتنہ پردازوں نے پہلے ہی سکھار کھا تھا جواب دیا ہم کو سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہے کہ ہم رات کو بے خوف ہو کر سوئے تھے صبح نہ ہونے پائی تھی کہ اہل بصرہ (لشکرام المؤمنین) نے حملہ کر دیا' ٹڈی دل گروہ تیر برساتا ہوا امڈ آیا' پس ہمارے ہمراہی بھی سوار ہوگئے اور لوگوں نے لڑائی چھیڑ دی امیر المؤمنین علیؓ یہ سن کر سوار ہوئے افسرانِ لشکر کو میمنہ و میسرہ پر مامور کر کے افسوس کرتے ہوئے فرمایا بے شک طلحہ و زبیر بغیر خون ریزی کئے ہوئے نہ مانیں گے قصہٗ مختصر دونوں فریق کو غلط فہمی ہوئی ایک نے دوسرے کو مجرم سمجھا اور اصل حال کسی پر منکشف نہ ہوا۔

(ایضاً ص ۴۹۹ ج ۱)

نا قابل تلافی نقصان

عبداللہ بن سودا کی عداوت اسلام بدستور شدید رہی اور آگے چل کر اس کے تیار کردہ گروہ نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی خروج کیا جو خوارج کی بحث میں آئے گا کیونکہ اس کا مقصد صرف اور صرف امت مسلمہ میں تفرقہ بازی اور نظریاتی تقسیم کا آغاز تھا وہ اپنی ذات میں نہ اہل بیت سے محبت رکھتا تھا اور نہ اہل دار خلافت سے عقیدت کا حامل تھا وہ نہ رافضی تھا اور نہ خارجی اور نہ ہی سنی تھا وہ ایک ھیولانی کردار کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھا' بہر حال وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ایک یہودی کیلئے جس کے آباء واجداد کے ہاتھ انبیاء علیھم السلام کے خون سے رنگے ہوئے ہوں کسی خلیفہ

کا قتل غیر معمولی بات نہیں، ایک ایسی قوم کا بیٹا جو انتشار اور انکار کا لباس پہنے ہوئے ہوا گر نفرت کی فضا قائم کر دے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ تعجب اس پر ہے کہ شیعان علی اس خبیث کی واضح عیاری کو کیوں سمجھ نہ سکے؟ بہر حال اس سازش کے نتیجہ میں عملاً روافض اور شیعان علی کی ایک بہت بڑی جماعت تو معرض وجود میں آ ہی گئی لیکن مع ہذا وہ خود بھی متحد نہ رہ سکے اور تفریق در تفریق کرتے کرتے کئی فرقوں میں منقسم ہو گئے جو مشہور و معروف ہیں۔

یہود کی نئی سوچ

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ نفرت اور منافرت یہود کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے وہ نہ خود چین اور سکون سے رہتے ہیں اور نہ ہی راحت والی زندگی دوسروں کیلئے برداشت کر سکتے ہیں اسی منافرت کی بنا پر وہ بخت نصر کی بربادی سے لیکر آج تک متحد ہو کر کسی ریاست کی نعمت کا مزہ چکھ نہ سکے وہ روئے زمین پر ہمیشہ منتشر ہی رہنے کے عادی ہو چکے ہیں تاہم مکاری و غداری اور فریب و دھو کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے اس لئے وہ دوسروں کو آپس میں لڑانے کی بھرپور صلاحیت کے مالک ہیں۔ یورپ ہو یا مشرق وسطی ہر جگہ ان کی ذلت اور ظلم کی داستانیں مشہور ہیں کیونکہ کمزور قوم جب بھی سر اٹھاتی ہے تو وہ ظلم کی انتہا کر دیتی ہے اس لئے یہود یا تو ذلیل رہتے ہیں یا پھر ظالم۔ عمومی طور پر یہود اپنی تخت و سلطنت سے محروم رہے ہیں لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے شاید ان لوگوں نے دنیا کی اقوام سے یہ سبق سیکھ لیا ہو کہ وحدت میں قوت نصیب ہوتی

ہے اس لئے سترہویں صدی میں انہوں نے صیہونیت کے نام سے ایک اور خفیہ سازش پر مبنی تحریک کاآغاز کرلیاصیہون دراصل یروشلم کے ایک پہاڑ کانام ہے جس کو یہ لوگ مقدس تصور کرتے ہیں یہ تحریک اسی کی طرف منسوب ہے اس کا مقصدارض فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنا تھا۔ چنانچہ 1896ء میں ویانا کے ایک یہودی صحافی ڈاکٹر ''تھیوڈورہرزل'' نے ریاست یہود کاایک تصور پیش کیااس کی رہنمائی میں 17 اگست 1897ء کو سوئزرلینڈ کے شہر ''بیسل'' میں صیہونیوں کی کانفرنس ہوئی اس کے نتیجے میں یہودیوں میں ہجرت فلسطین کی تحریک باقاعدہ شروع ہو گئی سب سے پہلے روس کے کچھ یہودی ارض مقدس پہنچے برطانیہ نے ان لوگوں کی بڑی مدد کی' انگریزوں نے ترکی کے سلطان عبدالحمید کے ساتھ ڈاکٹر ہرزل کی گفت و شنید میں یہودیوں کی خود مختاری تسلیم کرانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سلطان نے واضح الفاظ میں انکار کردیا۔

1898ء میں یہودیوں نے سلطان پر پھر سے بیرونی طاقتوں کا دباؤڈلوایااور دوسری طرف اس کا تختہ الٹنے کی سازشوں میں مصروف ہوگئے 1902ء میں ڈاکٹرہرزل کی موت کے بعد یہودنے ''دونمہ ''اور ''فری میسن'' کی تحریکوں کے ذریعے اپنی سازشیں تیزتر کردیں اوربالآخر 1908ء میں سلطان عبدالحمید کاتختہ الٹ دیا گیا۔

اس تاریخی انقلاب کے بعد ترکی میں جو حکومت بنی اس کے تین وزراء بصاریہ آفندی' نسیم مزلک' اور جاوید بے' یہودی تھے انہوں نے اپنااثرورسوخ استعمال کرناشروع کیااوربالآخر 1914ء میں یہودیوں کو ملکیت زمین کا حق

دلایا گیا' برطانیہ نے بھی یہودیوں کا ساتھ دیا اور نومبر 1917ء کو یہودی وطن بنانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

یہ اعلان ''اعلان بالفور'' کے نام سے مشہور ہے جو برطانوی وزیر خارجہ ''بالفور'' نے ان الفاظ میں کیا ''ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے' صیہونیت ہمارے لئے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے''

اعلان ''بالفور'' کے ساتھ ہی دنیا کے تمام ممالک سے یہودیوں کا ایک سیلاب فلسطین کی طرف اُمڈ پڑا' دیکھتے ہی دیکھتے فلسطین کے 26 سو یہودی 83 ہزار کی ایک منظم اور خوشحال قوم میں تبدیل ہو گئے' عربوں کی زمینیں دھڑا دھڑ ان کے نام منتقل ہونے لگیں اس موقع پر صیہونی لیڈر ڈاکٹر ویز نے کہا ''اگرچہ ہم فلسطین کو خالص یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں' اس کے باوجود جو عرب فلسطین میں رہنا چاہیں گے انہیں اس کی اجازت دی جائے گی لیکن جو نہ رہنا چاہیں گے ان کے لئے مصر ہے اور شام ہے''

(مکالمہ بین المذاہب ص 107)

اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ مختصر لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہود نے اسلامی دنیا کے بیچوں بیچ اپنا ایک ''مرکز فساد'' قائم کر کے ہر طرف مسلمانوں کی نقل و حرکت' تعمیر و ترقی اور تہذیب و تمدن کی رفتار کو وہ بتدریج کم کرنے کی منظم سازش کو روز افزوں تیز تر کرتے رہتے ہیں وہ مسلمانوں کے جتنے دشمن ہیں وہ تو ہیں ہی مع ھذا وہ مسلم امہ

کے ہر دشمن کے بھی جگری دوست ہیں وہ جس طرح عربوں کے خلاف کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اسی طرح پاکستان کے خلاف ہندوستان کی ہر خواہش پوری کرنے کیلئے سر توڑ کوششیں کرتے رہتے ہیں' اسرائیل نے فلسطین کے عوام اور عربوں کو واضح طور سے تقسیم کر دیا ہے وہ نہ صرف اقوام متحدہ جیسے ادارے کو اپنے نرغے میں لے چکے ہیں بلکہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک پر بھی پوری طرح براجمان ہیں وہ آئے روز مسلمانوں کیلئے عسکری اور اقتصادی مسائل کی دلدل تلاش کرنے میں مصروف عمل رہتے ہیں ہمارے ہی وسائل ہم پر مہنگے داموں بیچتے رہتے ہیں اور کمال عیاری کا عالم یہ ہے کہ ہم اس زہر آلود شہد پینے میں اُن کے احسان مند بھی رہتے ہیں۔

وہ مسلمانوں اور خصوصاً غریب اسلامی حکومتوں پر ایسی شرائط عائد کرتے رہتے ہیں جو بظاہر نرم لیکن در حقیقت وہ دین اسلام کا استیصال کرنے والی ہوتی ہیں یہ سازش عبداللہ بن سودا کی شرارت سے کسی طرح کم نہیں ہے یہ لوگ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر گامزن ہیں جس طرح یہود مدینہ نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر کے مسلمانوں سے لڑآئی کی ٹھانی تھی آج کے یہود بھی ہو بہو اسی طرح مسلمانوں کے مٹانے کیلئے ہر کافر ملک سے غیر مشروط دوستی و تعاون کیلئے تیار ہیں۔

نصاریٰ

اللہ جل مجدہ کا ارشاد گرامی ہے "لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُو الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ج وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ

قَا لُو آ انَّا نَصٰریٰ ط ذَالِکَ بِاَنَّ مِنۡھُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُھۡبَانًا وَّاَنَّھُمۡ لاَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۸۳)

ترجمہ: ''تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو اور مشرکوں کو اور تو پائے گا سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں کے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں' یہ اس واسطے کہ نصاری میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے''

اس آیت مبارکہ میں یہود و نصاریٰ کی جو حالت بتائی گئی ہے اس میں سے یہود کا کچھ مختصر تذکرہ آپ نے پڑھ لیا، رہے عیسائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد پاک میں ان کے ساتھ ٹکراؤ کی عام فضا نہیں بنی تھی اس کی ایک وجہ تو ان لوگوں کی نرمی اور تواضع تھی یہ دونوں ایسی خوبیاں ہیں جو آدمی کو قبول حق کے قریب تر کر دیتی ہیں چنانچہ قیصر روم' مقوقس مصر اور نجاشی ملک حبشہ نے جو کچھ برتاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام رسالت کے ساتھ کیا وہ اس بات کا شاہد ہے کہ اس وقت نصاریٰ میں قبول حق کی صلاحیت نسبتاً دوسری قوموں سے زائد تھی' تاہم ان آیات میں قیامت تک کیلئے کوئی خبر نہیں دی گئی کہ ہمیشہ عیسائیوں کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ یہی رہیں گے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ عیسائیوں کا عربوں پر وہ علمی رعب نہ تھا جو یہود کا تھا کیونکہ یہود قبائلی شکل میں وہاں آباد تھے جبکہ عربوں کی سرزمین پر عیسائی آبادی کافی کم تھی۔

بہرحال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ بہت اچھا تھا حتی کہ مشرکین عرب کیلئے دوٹوک حکم تھا کہ یا اسلام قبول کرلیں یا موت'

جبکہ اہل کتاب کیلئے جزیہ کی نرمی دی گئی ان کے ذبائح ہمارے لئے حلال کردیئے گئے اوران کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح جائز قرار دیدیا گیا۔

لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں میں باہم قرابت کی جو وجہ اور علت تھی وہ حق طلبی، دنیاسے بے رغبتی، آخرت کی کامرانی کی تلاش اور عجز وانکساری تھی۔ عیسائیوں میں جب ان عِلل کا فقدان آیا تو وہ بھی یہود کی مانند مسلمانوں کی دشمنی وعداوت کیلئے کمربستہ ہوئے پھر ان کے اور مسلمانوں کے درمیان جو صلیبی جنگیں لڑی گئیں وہ ناقابل فراموش ہیں ممکن ہے کہ ان جنگوں میں قومی تعصب کو بھی کافی دخل ہو۔

ہم ان لڑائیوں پر کچھ تبصرہ نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر صرف ان اقدامات کو اجاگر کرنا ہے جو مسلمانوں کی تفریق میں خفیہ سازش کے تحت مؤثر ثابت ہوئے ہیں اوران کے اثرات فرقہ بندی کے طور پرآج تک باقی ہیں۔

عیسائیوں کی سازش

مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے بدترین قسم کے اندھے تعصب کا اظہار صلیبی جنگ میں ہوا یورپ کی ساری عیسائی طاقتیں بیت المقدس کی طرف اُمڈآئیں تاکہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیں۔

دوسوبرس کی لڑائیوں سے لاکھوں مسلمانوں کی جانیں گئیں، عورتوں کو بےآبرو کیا گیا۔ عیسائیوں کو شروع میں اس لئے فتح ہورہی تھی کہ مسلمانوں میں یکجہتی نہ تھی، بالآخر دوصدیوں کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اپنی ہوش

مندی، بیدار مغزی اور سپہ گری سے نہ صرف اپنوں کی سازشوں پر قابو پایا بلکہ صلیبیوں کو بھی ذلت آمیز شکست دی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس شکست و ذلت سے عیسائی بھی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں سے بزور بازو نمٹنا ممکن نہیں ان کو کمزور کرنے کا واحد راستہ خفیہ سازش اور ان کے درمیان تفریق کا عمل ہے، چنانچہ اب انہوں نے اپنی توجہ اسی نکتے پر مرکوز کرلی وہ ایک طرف ہندوستان میں چور دروازے سے داخل ہو کر اپنا اثر ورسوخ بڑھاتے بڑھاتے زمام حکومت تک اپنے ہاتھ پہنچانے میں کامیاب ہوگئے اور پھر فارسی زبان کو بیک جنبش قلم ختم کرکے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیکر مذہبی اور روشن خیالی کے دو الگ الگ راستوں کے تعین میں کامیاب ہوگئے۔ دوسری جانب عربوں کو ترکوں سے لڑا کر دولت عثمانیہ کا خیمہ اٹھوا دیا جس کے رد عمل میں مصطفی کمال پاشا نے عربوں سے اپنی نفرت اور غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ اسلام کو اپنے ملک سے اور خصوصاً عربی زبان کو ترکی سے دربدر کرنے کے متعصّبانہ اقدامات کئے۔

اسلام اور مستشرقین

مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں نے جنگی اور حربی محاذ کھولنے کے ساتھ ایک علمی محاذ بھی کھول رکھا ہے، عیسائی مصنفین خصوصاً مستشرقین نے عربی کی قلمی کتابوں کے کیٹلاگ مرتب کئے، قرآن مجید کے ترجمے کئے، ڈکشنری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تدوین کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی سیرت لکھی، اَلسِنۂ مشرقیہ کے مدارس اور کتب خانے کھولے مگر یہ ساری علمی سر گرمیاں اس لئے جاری ہیں کہ ان ہی کتابوں کا سہارا لیکر اپنی مناظرانہ تحریروں، مجادلانہ استدلالوں، گمراہ کن منطقیانہ مغالطوں، پھر تحریفات و تلبیسات دور از کار قیاسات اور احتمالات سے معلولات کا سلسلہ پیدا کر کے اسلام کے رسول، قرآن، حدیث، مسلمانوں کی تاریخ، فقہ اور معتقدات وغیرہ سے نفرت پھیلائی جائے اور اگر نفرت نہ پیدا ہو تو کم از کم ذہنی شکوک اور کشمکش تو مسلمانوں میں پیدا ہی ہو جائے۔

(مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب ص ۶۷)

آج کل کے عیسائی اور مستغربین

اہل یورپ کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے اندلس (سپین) کو واپس چھیننے کیلئے ساڑھے تین ہزار لڑائیاں لڑنی پڑیں (مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب ص ۴۰) اور یہ سلسلہ انہوں نے آٹھ سو سال تک جاری رکھا لیکن وہ اپنی مراد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اسی طرح مشرق وسطی کی صلیبی جنگوں میں دو صدیوں تک شکست سے دوچار ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کی تفریق کا عمل تیز تر کر دیا اور دوسری جانب عسکری برتری حاصل کرنے کی غرض سے طویل المدتی منصوبہ بندی کرنے میں ہمہ تن مستغرق ہو گئے۔

ان کو یقین ہو ا چلا تھا کہ اگر مسلمان اس طرح متحد رہے تو وحدت کی برکات ہمیشہ کیلئے حاصل کرتے رہیں گے اس طرح ان کے خلاف کبھی بھی جنگ جیتی نہیں جا سکے گی چنانچہ انہوں نے بڑی مہارت سے پہلے اندلس اور پھر

ترکی و ہندوستان کے مسلمانوں کے مابین نفرت کا بیج بویا اور یقیناوہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے آج کل انہوں نے ایک جانب عقائد و اعمال کی جنگ میں بہت سے مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنایا ہے اور دوسری طرف عراق و افغانستان سمیت فلسطین کے مسلمانوں پر اپنی مرضی کا حل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ 2008ء کے وسط سے پاکستان پر امریکی جارحیت میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے اور تادم تحریر جاری ہے۔

اس صورتحال میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ صدیوں سے اپنی حکومت قائم کرنے سے تو ویسے بھی محروم تھے ہمیشہ باہر سے کوئی آ کر ان کا حکمران بن جاتا مگر جب سے انگریز نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمائے تو اس وقت سے آج تک مسلمان انگریز سے بہت مرعوب رہا، اس رعب کا منحوس اثر یہ ہوا کہ انگریز کی بات میں ان کو بڑا وزن نظر آتا ہے خاص کر روشن خیال طبقہ اس مرعوبیت کی وجہ سے اتنا متاثر ہے کہ اگر ایک طرف حدیث رکھی جائے اور دوسری جانب کسی مستشرق کا مقولہ تو وہ اگر عارض کی وجہ سے حدیث کو ترجیح دے تو دیدیگا لیکن شرح صدر اس کا یورپی و مغربی مقولہ سے زیادہ ہوتا ہے مسلمانوں کی عملی زندگی میں تو یہ عنصر نمایاں طور سے نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت سے لیکر آج تک انکار حدیث کا فتنہ مسلسل بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔

خوارج

یہود و نصاریٰ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں دین حق کے متبع تھے یہ

لوگ بالترتیب اسلام پر زماناً مقدم تھے جب اللہ جل شانہ نے اہل دنیا کو اسلام کی نعمت سے نوازا تو اس کے ساتھ سابقہ تمام ادیان و مذاہب منسوخ کر دیئے گئے لیکن عناد کی وجہ سے یہ لوگ اس حقیقت کا انکار کرتے ہوئے اپنے مذہب پر ڈٹے رہے اور اسلام سے باہر رہتے ہوئے مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے تاہم یہود بخت نصر کے بعد اپنی ریاست بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے تھے اس لئے ان کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ فوجی و عسکری نوعیت کا پیش نہیں آیا ہے وہ ہمیشہ سازشوں میں سر گرم رہے ہیں، اب انہوں نے فلسطین میں اسرائیل نام کی قابضانہ حکومت تشکیل دی ہے جس کے بل بوتے پر نہتے فلسطینیوں کا قتل عام جاری ہے عیسائی چونکہ بڑی بڑی حکومتوں کے مالک رہے ہیں اس لئے مسلمانوں کی سب سے زیادہ جنگیں ان ہی کے ساتھ ہوئی ہیں علاوہ ازیں انہوں نے سازشوں کا بازار بھی ہمیشہ گرم رکھا ہے جس کا کچھ تذکرہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں اور شائد کچھ ذکر قادیانیوں کے ضمن میں بھی آجائے۔

بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی بھی اسلام کے دعویدار نہیں رہے بلکہ اعلانیہ انکار ہی کرتے رہے۔ گویا یہ خارجی فتنے ہیں۔

نام نہاد اسلامی فرقے

اب ان فتنوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو اسلام کے نام پر تفریق بین المسلمین کے ایجنڈے پر کاربند رہے خواہ وہ ذاتی شرارت' جہالت اور حب جاہ و ریاست کی بنا پر ہو یا یہود و نصاریٰ کے اشاروں پر، ان کو اندرون فتنوں سے تعبیر کرنا مناسب ہے اسلام کو جتنا نقصان یہود و نصاریٰ سے ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ

اندروں فتنوں سے پہنچا ہے اختصاراًان کا تذکرہ بھی نذر قارئین ہے۔

جس وقت جنگ صفین مین امیر المؤ منین حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنھما کے درمیان صلح کی بات چیت کا آغاز ہوا اور طرفین سے حکمین مقرر ہوئے تو اس پر بعض لوگ برہم ہوئے کہ جنگ روک کر حکم مقرر کرنے کا کیا مطلب ہے یہ تو خدا کے حکم کی خلاف ورزی ہے'مسعر بن فدک تمیمی اور زید بن حصین الطائی بولے اے علی! کتاب اللہ کو قبول کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عفان (حضرت عثمانؓ) کے ساتھ ہم نے کیا، ان لوگوں نے حکمین کے تقرر سے اختلاف کیا اور امیر المؤ منین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علیحدہ ہو کر دوسری راہ کو اختیار کیا۔

خوارج آپ سے علیحدہ ہو کر حروراء کی طرف آئے اور وہی بارہ ہزار کی جمعیت سے قیام کیا دس شوال ۳۸ھجری کو خوارج نے عبداللہ بن وہب کے ہاتھ پر بیعت کرلی' پھر زید بن حصین کی رائے پر عمل کرتے ہوئے یہ لوگ نہروان کے پل کی جانب روانہ ہوئے تا کہ وہاں اپنا ایک مرکز قائم کرکے اپنے بھائیوں کو وہاں بلوا سکیں، ادھر بصرہ کے خوارج کو پتہ چلا تو وہ پانچ سو کی جمعیت کے ساتھ بصرہ سے خروج کرکے دجلہ کے پل پر پہنچے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حکم سے ابوالاسود الدولی نے تعاقب کیا اور فریقین کے درمیان عصر سے عشاء تک لڑائی ہوئی جو رات کی تاریکی کی وجہ سے خود بخود ختم ہو گئی۔

خوارج بصرہ کی ملاقات راستہ میں نہروان کے قریب حضرت عبداللہ بن خباب صحابی سے ہوئی، انہوں نے عبداللہ بن خباب سے حضرات شیخین ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے لوگ تھے عبداللہ بن خباب نے کہا وہ

دونوں بہت اچھے تھے' پھر اول اور آخر زمانۂ خلافت عثمان بن عفان کی بابت دریافت کیا جواب دیا اول تا آخر حق جو، حق پسند تھے پھر حضرت علیؓ کی بابت حکم مقرر کرنے کے قبل اور بعد سوال کیا جواب دیا وہ تم سے زیادہ اللہ کے احکام کو سمجھنے اور جاننے والے اور دین حق پر چلنے والے ہیں، خوارج جھلا کر بولے...... تم شخصیت کی پرستش کرتے ہو اور ان کے کارناموں کی وجہ سے ان کو اچھا کہتے ہو، یہ کہہ کر ان کو ذبح کر ڈالا، ان کی بیوی اور تین عورتوں کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔

(تاریخ ابن خلدون مترجم نفیس اکیڈیمی کراچی ص ۵۲۷ تا ص ۵۴۰ ج ۱)

خوارج نے نئے نظریات کی اختراع کی اور جمہور امت سے الگ تھلگ ہو گئے ان کے عقیدے کے مطابق جو آدمی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے وہ کافر ہو جاتا ہے بلکہ بعض تو صغیرہ کے ارتکاب سے بھی کفر کی نسبت کرتے ہیں۔ پھر ان میں بھی روافض کی طرح بہت سے ذیلی فرقے بن گئے جنہوں نے اپنے اپنے عقائد و نظریات کی بنیادیں ڈالیں۔

معتزلہ

حضرت حسن بصریؒ کے درس میں ایک آدمی حاضر ہو کر کہنے لگا ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں یعنی خوارج اور کچھ ایسے ہیں جو مؤمن کے لئے کسی قسم کا گناہ مضر نہیں سمجھتے ہیں یعنی مرجیہ حضرت حسن بصری سوچنے لگے ان کے جواب سے پہلے ہی واصل بن عطاء المتوفی ۱۳۱ ھجری نے جواب دیا کہ میں صاحب کبیرہ کو نہ مطلق کافر کہتا ہوں اور نہ

ہی بالکلیہ مؤمن، پھر مسجد کے ستون کے پاس کھڑے ہو کر سابقہ جملہ دھراتا رہا حسن بصری نے کہا واصل ہم سے علیحدہ ہو گیا اسی وقت سے ان کے پیرو کاروں کا نام معتزلہ پڑ گیا کیونکہ اعتزال کے معنی علیحد گی اور جدائی کے ہیں، شرح عقائد میں ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ مطیع وفرمانبردار کے ثواب کو اللہ پر لازم مانتے ہیں اور گنہگار کے عذاب کو ضروری مانتے ہیں۔ اور صفات باری تعالیٰ کی عینیت کے قائل ہیں جو دراصل نفی ہی ہے پھر ان لوگوں نے عقائد کے باب میں بہت غلو سے کام لیا اور فلاسفہ کے بہت سے اصول پر کاربند ہوئے ان کا مذہب بہت پھیل گیا یہاں تک کہ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ نے اپنے استاذ ابو علی جبائی سے پوچھا کہ آپ کا ان تین بھائیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن میں سے ایک نیک ہے اور دوسرا گنہگار اور تیسرا بچپن ہی میں فوت ہو گیا؟ جبائی نے کہا کہ پہلا جنت میں جائے گا، دوسرا دوزخ میں جبکہ تیسرا نہ ثواب کا مستحق ہے اور نہ ہی عذاب کا امام اشعری نے پھر سوال کیا کہ یہ چھوٹا والا اگر اللہ سے کہے کہ یارب مجھے بچپن میں کیوں موت دی مجھے بڑا ہونے دیتے تو میں تجھ پر ایمان لا کر، تیری اطاعت کر کے جنت میں چلا جاتا، تو رب کیا جواب دیں گے؟ جبائی نے کہا "اللہ فرمائیں گے کہ مجھے پتہ تھا کہ اگر تو بڑا ہو جاتا تو نافرمان بن کر دوزخ میں چلا جاتا اس لئے تیرے لئے یہی بہتر تھا کہ بچپن میں مرا" امام اشعری نے تیسرا سوال کیا کہ اگر وہ دوسرا (کافر) پوچھے کہ اے رب مجھے کیوں بچپن میں موت نہ دی تا کہ میں گناہ ہی نہ کرتا اور جہنم میں نہ جاتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کیا جواب دیں گے؟ اس پر جبائی بالکل خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا، پھر امام اشعری نے جبائی

کا مذہب چھوڑ کر اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کے ساتھ معتزلہ کے مذہب کی تردید میں لگ گئے اور جو احکام سنت سے ثابت ہیں یا ان پر اجماع چلا آرہا ہے ان کے اثبات میں مشغول ہوئے اس لئے وہ اہل سنت والجماعت کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

معتزلہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اختلافی مسائل کیلئے قواعد واصول وضع کئے اور اہل سنت والجماعت سے ان کے مناظروں کا بازار گرم رہا، شرح مقاصد' شرح مواقف اور شرح عقائد کے اکثر مسائل ہمارے اور معتزلہ کے درمیان اختلافی ہیں چونکہ مامون الرشید وغیرہ عباسی خلفاء ان سے عقلی انداز استدلال کی بنا پر متاثر تھے اس لئے ان کو سرکاری مناصب پر فائز کیا جاتا رہا بنابریں ان میں بڑے بڑے علماء گزرے ہیں خصوصاً علامہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف، امام جصاص پر بھی اعتزال کا الزام ہے آج کل کے روشن خیال طبقے کے خیالات معتزلہ سے ملتے جلتے ہیں اگرچہ ان کے اور معتزلہ کے علمی معیار میں زمین وآسمان کا فرق ہے تاہم نصوص کو ظاہر سے پھیرنے اور عقل کے تابع کرنے یا پھر ان سے انکار کرنے میں یہ دونوں طبقے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت سے خروج کا مطلب

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ اہل السنۃ کسی مخصوص مکتب فکر کا نام نہیں کہ آدمی جب ان کے ساتھ نہ ہو تو وہ اہل السنۃ والجماعت سے نہ ہوگا بلکہ جو لوگ اہل قبلہ ہیں یعنی جو ضروریات دین اور بدیہیات کو مانتے ہیں ان میں دو طرح کے لوگ ہیں (۱) اہل سنت (۲) اہل

وجہ حصریہ ہے کہ مسائل واحکام کی دو قسمیں ہیں نمبر ایک وہ جو قرآن و سنت سے صراحتاً ثابت ہیں اور صحابہ کرام و تابعین کا ان پر اجماع چلا ہے۔ نمبر دو وہ مسائل جن پر قرآن و سنت صریح نہیں اور نہ ہی صحابہ کرام سے ان کے بارے میں کچھ وضاحت منقول ہے، پس جو لوگ پہلی قسم کے مسائل میں کسی طرح کی تاویل کے قائل نہیں بلکہ انہیں بلاچون و چرا مانتے ہیں خواہ وہ بظاہر اصول عقلیہ سے متصادم کیوں نہ ہوں تو وہ لوگ اہل السنت والجماعت کہلائیں گے اور جو ان میں یہ کہہ کر تاویل کرتا ہو کہ یہ عقل کے خلاف ہیں وہ شخص اہلسنت والجماعت میں سے نہ ہو گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کوئی منصوص مسئلہ عقل کے خلاف نہیں بلکہ عقل خود اس کی حقانیت کی گواہی دیتی ہے ان مسائل میں سے قبر میں سوال ہونا، اعمال کا وزن ہونا، صراط پر سے گزرنا، رؤیت باری تعالیٰ اور کرامات اولیا وغیرہ شامل ہیں، جن کو اہل سنت تاویل کئے بغیر مانتے ہیں جبکہ معتزلہ ان میں تاویل کے قائل ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے مسائل میں علماء نے اختلاف بھی کیا ہے اور بحث بھی کی ہے گو کہ اسلاف ان میں خاموش رہے ہیں ایسے مباحث میں بحث کرنے اور ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے والے اہلسنت و الجماعت سے خارج تصور نہیں کئے جاتے، کیونکہ ان مسائل میں احتمالات مبینہ کی گنجائش ہے۔

مثلاً فرشتوں اور انبیاء میں کون افضل ہیں، حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھما میں سے کون افضل ہیں یا امور عامہ کے مسائل جیسے وجود، وجوب

اور امکان کی بحث یا جوہر اور عرض کے مباحث یا صفات باری تعالیٰ میں بعض کے مطلب میں اختلاف ہونا جیسے وجہہ، ضحک اور استواء علی العرش وغیرہ تاہم انبیاء کا فرشتوں سے افضل ہونے کا مسئلہ شرح عقائد کے اخیر میں ذکر کرکے اس میں فلاسفہ، معتزلہ اور بعض اشاعرہ کا اختلاف نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جمہور اشاعرہ انبیاء علیھم السلام کی تفضیل کے قائل ہیں۔

جہمیہ، کرامیہ، جبریہ اور قدریہ

یہ چھوٹے چھوٹے فرقے کسی زمانے میں ہوا کرتے تھے جن کے پیروکار آج کل یا تو ختم ہو گئے ہیں یا پھر بحیثیت جماعت ان ناموں سے نہیں پائے جاتے گو کہ ان کے جزوی عقائد ہر دور میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

قدریہ وہ لوگ ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں چونکہ یہ لوگ تقدیر میں بہت بحث کرتے تھے اس لئے ان کا نام قدریہ پڑ گیا آج کل بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ان نظریات کے حاملین لیکچرار بکثرت پائے جاتے ہیں ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور اعمال تقدیر سے بندھے ہوئے ہرگز نہیں بلکہ وہ اپنے کلی اختیار سے جو کچھ کرتا ہے وہ اولین وجود میں آتا ہے اس کا سابقہ کوئی ریکارڈ یا اجمالی وجود نہیں ہوتا ہے ان کے برعکس جبریہ انسان کو تقدیر کے آگے بے بس جماد محض کی مانند تصور کرتے ہیں گویا پہلا گروہ انسان کو خالق مانتا ہے اور دوسرا پتھر کی طرح عاجز و مجبور جبکہ حقیقت دونوں کے درمیان ہے کہ انسان کاسب تو ہے مگر خالق یا مجبور نہیں، تفصیل شرح عقائد وغیرہ کتب عقائد میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جہمیہ، جہم بن صفوان الترمذی کی طرف منسوب ہیں جو صفات باری تعالیٰ کا انکار کرتا تھااور کہتا کہ صفات ماننا توحید اور بساطت ذات و تنزیہ کے منافی ہے، یہ شخص تابعین کے اخیر دور میں گزرا ہے شیخ ابن ھمام رحمہ اللہ نے اس شخص سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مناظرہ نقل کرکے لکھا ہے کہ امام صاحب نے اس سے کہا "اخرج عنی یا کافر" لھذا نواب صدیق حسن خان صاحب کا امام صاحب پر جہمی ہونے کا الزام سراسر غلط ہے۔

کرامیہ: محمد بن کرام کی طرف منسوب ہیں یہ جہمیہ کے بالکل مقابل ہیں حضرت شاہ صاحب "عرف شذی" میں ان دونوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جہمیہ بالکل اہل باطن کی طرح ہیں جبکہ کرامیہ اہل ظاہر کی مانند ہیں اور "خیر الامور اوسطہا" کے مطابق اہلسنت والجماعت صفات باری تعالیٰ کا نہ انکار کرتے ہیں جیسا کہ جہمیہ نے کیا ہے اور نہ ہی جوارح و جسامت کے قائل ہیں جیسا کہ کرامیہ ہیں۔ بلکہ اسلاف نے تفویض سے کام لیا اور متأخرین نے تاویل سے کہ اصل یہ ہے "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْئٌ" علاوہ ازیں ان کا اہلسنت والجماعت کے ساتھ ایمان کے مسئلہ میں بھی اختلاف مشہور و معروف ہے۔ لیکن ان فرقوں کے اثرات آج کل زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تفصیل اسی طرح دیگر ان گمراہ فرقوں کے تذکرہ کی بھی چنداں ضرورت نہیں جو مٹ چکے ہیں اور اپنی موت آپ مر چکے۔

مدعیانِ نبوت و مہدویت

ویسے تو نبوت اور مہدیت کے جھوٹے دعویداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے

اور شروع سے لیکر آج تک یہ فتنہ مختلف لوگوں کی شکل میں متحرک ہے اس لئے اس سلسلۂ کذب اور دجل کی چند اہم کڑیاں مختصراً ذکر کی جاتی ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ہی میں تین لوگوں نے نبوت کا دعوی کیا تھا (۱) اسود عنسی، (۲) مسیلمہ کذاب (۳) اور طلیحہ، اسود عنسی کا نام عبہلہ بن کعب اور لقب ذوالحمار تھا اس نے دعوے کے بعد اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور نجران کے لوگوں کی بڑی تعداد نے اسے مان لیا اس نے حضرت عمرو بن حزم اور خالد بن سعید رضی اللہ عنھما کو وہاں سے نکال دیا، پھر صنعاء کی طرف بڑھا اور شہر ابن باذان کو مار ڈالا اور اس کی بیوی مسماۃ بہ آزاد سے نکاح کرلیا، اہل یمن کی اکثریت بھی مرتد ہو گئی، آزاد فیروز کی چچازاد بہن تھیں پوشیدہ خط و کتابت کے ذریعہ ایک رات فیروز اور قیس بن عبدیغوث نے اسود کے گھر میں نقب کے ذریعہ گھس کر اسے ذبح کر دیا اور ایک قاصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا ادھر بذریعہ وحی اللہ جل مجدہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ سے آگاہ فرمایا لیکن جب قاصد پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوچکا تھا۔ (مختصر از تاریخ ابن خلدون مترجم ص ۲۰۳، ۲۰۲ج۱)
طلیحہ اسدی کی سرکوبی نہ ہونے پائی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی خبر مشہور ہو گئی جس سے طلیحہ کو ایک گونہ استحکام ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کیا، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے طلیحہ سے مقابلہ کیا، طلیحہ کے ساتھی اسے میدان جنگ میں چھوڑ کر علیحدہ ہوگئے اور بہت سے مارے گئے، طلیحہ اپنی بیوی کے ساتھ شام کی طرف بھاگ

گیا مگر پھر مطیع و فرمانبردار بن کر مدینہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مسیلمہ کذاب سے مسلمانوں کی یمامہ کے مقام پر سخت جنگ ہوئی مسیلمہ کے ہمراہ اس معرکہ میں چالیس ہزار فوج تھی جبکہ مسلمانوں کا لشکر تیرہ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا جس کی افسری خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کر رہے تھے انتہائی سخت لڑائی کے بعد قلعہ کے اندر جانے میں کامیابی نصیب ہوئی مسیلمہ سوار ہو کر باہر نکلا حضرت وحشی نے ایک ایسا تیر مارا کہ مسیلمہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا، اس جنگ میں بنو حنیفہ کے سترہ ہزار جنگ آور جو مسیلمہ کے ساتھی تھے مارے گئے۔

(تاریخ ابن خلدون ص۲۳۶، ص ۲۴۳ ج ۱)

ذکری

جمادی الاولیٰ ۸۴۷ ھجری مطابق ستمبر ۱۴۴۳ء میں محمد بن یوسف نامی ایک شخص ہندوستان کے علاقے جونپور (دوآبہ) میں پیدا ہوا والد کا نام یوسف اور والدہ کا نام آقا ملک (آغا ملک) تھا مگر جب اس نے مہدی ہونے کے دعوے کا ارادہ کیا تو والدین کے نام تبدیل کر کے عبداللہ اور آمنہ رکھدیا تا کہ وہ مہدی صادق پر فٹ ہو جائے ۹۰۱ ھجری میں حج کیلئے چلے گئے مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر مہدی ہونے کا اعلان کیا، پھر ہندوستان واپس لوٹ آئے سب سے پہلے احمد آباد (گجرات) میں داخل ہوئے ۹۰۵ ھجری میں سندھ کے علاقہ ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے بلوچستان کے راستے قندھار اور پھر ''فراہ'' جا پہنچے اور وہیں پر ۱۹

ذیقعدہ ۹۱۰ھجری میں بروز دوشنبہ انتقال کر گئے۔(احسن الفتاویٰ ص۱۸۹ ج۱بحوالہ مہدوی تحریک ص۴۶)

جونپوری کی وفات کے بعد ان کے مریدین منتشر ہوئے ان کے پیرو کاروں میں ایک شخص ''ملا محمد اٹکی'' تھا جو پنجاب کے شہر اٹک کا رہنے والا تھا، وہ اپنے پیش رو کے نقش قدم پر چلتا ہوا ایران گیا اور پھر واپسی پر تربت میں نبوت کا مدعی بن بیٹھا اس سے پہلے مہدی ہونے کا بھی مدعی ہوا تھا یہاں ان دونوں ناموں اور موجودہ ذکریوں کے بارے میں ایک بہت بڑی الجھن درپیش ہے کہ ذکری کس محمد کے پیرو کار ہیں اور یہ کہ محمد ایک ہی ہے یا دو الگ الگ اشخاص ہیں اگر دو ہیں تو دوسرا شخص پہلے کا مرید ہے یا محض معتقد، یا علیحدہ مدعی ہے کیونکہ دوم محمد کی سن پیدائش ۹۷۷ھجری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی براہ راست جونپوری سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، واللہ اعلم

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ذکری اپنی نسبت کبھی ایک کی طرف کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کی جانب گویا تقیہ کرتے ہیں، ان کا دعوی ہے کہ مہدی آخر الزمان نے شرع اسلامی کو منسوخ کیا ہے لہذا اب نماز، روزہ اور حج وغیرہ احکام منسوخ ہو گئے ہیں ان کی جگہ صرف ذکر ہے۔

(ماخوذ از ذکری مذہب کی حقیقت ص۹، ص۱۰ مفتی احتشام الحق مدظلہ)

راقم کو وفاق المدارس العربیہ کے تحت امتحان کے سلسلے میں کئی بار تربت جانے کا اتفاق ہوا پہلی بار جب ایئر پورٹ سے شہر جا رہا تھا تو گاڑی کے ڈرائیور نے اس سلسلے میں بات چیت شروع کی بعد میں پتہ چلا کہ یہاں تو ذکریوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے وہ کوہ مراد پر حج بھی کرتے ہیں اور ذکر خانوں میں ذکر

بھی انکے مذہب کی خرافات بہت زیادہ ہیں، اور کلمہ بھی الگ ہے، موجودہ دور میں راقم کے علم کے مطابق ذکریوں کے خلاف سب سے زیادہ کام حضرت مفتی احتشام الحق آسیاآبادی دامت برکاتھم نے کیاہے اللہ قبول فرمائے اوران کواس کااجرعطافرمائے۔

قادیانی

جیسا کہ پیچھے عرض کیاجاچکاہے کہ عیسائی برادری اسلام کے خلاف مختلف دو محاذوں پر سر گرم عمل ہے، ایک جانب عسکری و فوجی ساز و سامان کی جمع تالیف پراپنی توانائی کابڑاحصہ خرچ کررہی ہے اور دوسری طرف علمی شکل میں پروپیگنڈے اور اسلام کے خلاف منفی تاثرات پھیلانے کے ساتھ مسلمانوں کے اندر ہی اندر ایسے رجال کار تیار کرنے پر اپنی توجہ مرتکز کئے ہوئے ہے جو نسلاً مشرقی ہوں اور نظریاتی اعتبار سے مغربی ذہنیت کا پرچار کرتے ہوں۔ یہ کام تو اصلاً یونانیوں اور رومیوں (اٹلی والوں) کا تھا لیکن اس میں زیادہ پیش پیش چار مما لک ہیں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور امریکہ پھر ان میں امریکہ جتناآج آگے آگے ہے اتنا ہی برطانیہ کی عالمگیریت کے زمانہ میں انگریز سباق الغیات تھے، برطانیہ نے ہندوستان، ترکی اور مصر کے اندر ایسے لوگوں کاایک جال بچھادیاتھا خصوصاجب اسے یقین ہواچلاتھا کہ اب ہندوستان میں اس کیلئے کوئی جائے پناہ نہیں تو اس نے پیسوں کا بے دریغ استعمال کرکے بڑی تعداد میں زرخرید جاگیرداروں، حکمرانوں اور عاقبت نااندیش بعض علما کو خریدلیا، کہ اگران کی

حکومت نہ رہے مگر ناسور تو رہے، گویا اس نے ایک اور صلیبی جنگوں کی تیاری کا آغاز اس طرح کیا کہ مسلمانوں میں فحاشی و عریانی عام کی جائے، اور ان کے دلوں سے جہاد کا جذبہ ختم کیا جائے تا کہ جب وہ دوبارہ ان کے گریبان میں ہاتھ ڈالے تو یہ مردانگی و بہادری اور دلیری کی صفت خاصہ سے عاری ہو چکے ہوں اس طرح ان کا کام آسان ہو جائے گا۔

عریانی اور فحاشی کیلئے دو چیزیں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی موسیقی اور بے پردگی کا عام ہونا جبکہ ان دونوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ احادیث مبارکہ ہیں اس لئے ان لوگوں نے اپنی توجہ اس مقصد کی طرف مبذول کرتے ہوئے انکار حدیث کی راہ ہموار کرنے کی باقاعدہ تحریک شروع کردی جس کا ذکر انشاء اللہ عن قریب آنے والا ہے۔

جہاد کی نفی اور مسلمانوں کی جمعیت منتشر کرنے کی غرض سے انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸) کو یہ خدمات سونپ دیں جو اس نے خوشی سے قبول کرلیں بلکہ شاید وہ انگریزوں کی توقعات سے کہیں زیادہ وفادار نکلا اس نے اپنے دجل و فریب کیلئے بقدر تین الماریاں کتابیں لکھیں اور نبوت کا دعویٰ کرکے صرف دنیوی لالچ کی خاطر خود کو، اپنے اہل و عیال کو اور سب پیروکاروں کو جو بغیر توبہ کے مر چکے ہیں دوزخ کا ایندھن بنادیا، دوسری طرف ایک نازک موقع پر مسلمانوں کے درمیان تفریق و انتشار پیدا کرکے زبردست نقصان کا موجب بنا۔

اس نے نہ صرف نبوت کا دعویٰ کیا بلکہ اس سے اختلاف رکھنے اور انکار کرنے والوں کو کافر بھی قرار دیا گویا وہ ساری مسلم آبادی کو غیر مسلم گردانتا

ہے مزید براں وہ صرف اسلام ہی کا دشمن نہیں بلکہ پاکستان کے وجود کے بھی خلاف ہے چنانچہ جناب مجید نظامی صاحب چیف ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت لاہور، جناب محمد متین خالد صاحب کی کتاب ''ثبوت حاضر ہیں'' پر اپنی تقریظ کے ضمن میں لکھتے ہیں قادیانیوں کی امنگوں اور آرزوں کا مرکز قادیان ہے جو بھارت میں واقع ہے یہ تصور ان کا جزو ایمان ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور واپس قادیان جائیں گے...... یعنی مغربی پاکستان بھی خدانخواستہ بھارت کا حصہ بن جائے (ثبوت حاضر ہیں ص ۲۲) وہ اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں: واقعات کے لحاظ سے یہ گروہ برطانیہ، اسرائیل اور بھارت کے ففتھ کالمسٹ کی حیثیت رکھتا ہے جو پاکستان میں سر گرم عمل ہے اور اس کی وفاداری بھی مشکوک ہے۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ قادیانی گویا یہود اور نصاریٰ دونوں کے آلۂ کار اور سازش کا حصہ ہونے کے ساتھ ہنود کے بھی ایجنٹ ہیں۔ اس سے ایک اور سازش کا پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں یہ تینوں قوتیں ملکر اسلام اور خصوصاً پاکستان کے خلاف سر گرم عمل ہیں۔

جناب مجید نظامی صاحب صفحہ نمبر ۲۴ پر رقمطراز ہیں ''علامہ اقبال اس گروہ کو یہودیت کا چربہ قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوجاتی، اچھی طرح ظاہر ہونے کیلئے برسوں چاہئیں...... ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت...... بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعوی کیا گیا، اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا، درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے،،
(اسٹیٹس مین کے جواب میں، حرف اقبال از لطیف شیر وانی)

علامہ صاحب مزید فرماتے ہیں ''ثانیا'' ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے، بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے، اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا، علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں جتنے سکھ، ہندوؤں سے، کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں، اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے،،
(اسٹیٹس مین کے جواب میں، حرف اقبال از لطیف شیر وانی)
(''ثبوت حاضر ہیں'' ص ۲۴)

اللہ کے فضل و کرم سے بھٹو حکومت کے دور ستمبر 1974ء میں پارلیمنٹ میں بڑی مفصل بحث کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تھا۔ اب یہ لوگ نہ صرف شرعی اعتبار سے کافر کہلائیں گے بلکہ آئین اور قانونی حوالے سے بھی غیر مسلم ہیں۔ قادیانی کے دعوؤں کی کچھ مزید تفصیل آگے آئے گی ''ایں راہ کہ تومی روی بتر کستان است'' عنوان کے تحت ملاحظہ ہو۔

منکرین حدیث

امت محمدیہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث' قرآن کریم کے بعد دین کا دوسرا اہم مأخذ ہے، لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں جب مسلمانوں پر مغربی اقوام کا سیاسی و نظریاتی تسلط بڑھا تو کم علم مسلمانوں کا ایسا طبقہ وجود میں آیا جو مغربی افکار سے بے حد مرعوب تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ترقی بغیر تقلید مغرب کے حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اسلام کے بہت سے احکام اس کے راستہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اس لئے اُس نے اسلام میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا، تا کہ اسے مغربی افکار کے مطابق بنایا جا سکے اس طبقہ کو ''اہل تجدد'' کہا جاتا ہے، ہندوستان میں سر سید احمد خان، مصر میں طٰہٰ حسین، ترکی میں ضیاء گوک الپ اس طبقہ کے رہنما ہیں، اس طبقہ کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے تھے جب تک حدیث کو راستہ سے نہ ہٹایا جائے کیونکہ احادیث میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ایسی مفصل ہدایات موجود ہیں جو مغربی افکار سے صراحۃً متصادم ہیں، چنانچہ اس طبقہ کے بعض افراد نے حدیث کو حجت ماننے سے انکار کیا۔ یہ آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خان اور ان کے رفیق مولوی چراغ علی نے بلند کی، لیکن انہوں نے انکارِ حدیث کے نظریہ کو علی الاعلان اور بوضاحت پیش کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں کوئی حدیث اپنے مدعا کے خلاف نظر آئی، اس کی صحت سے انکار کر دیا...... خواہ اس کی سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، اور ساتھ ہی کہیں کہیں اس بات کا بھی اظہار کیا جاتا رہا کہ یہ احادیث موجودہ دور میں حجت نہیں ہونی چاہیں، اور اس کے ساتھ بعض مقامات پر مفید مطلب احادیث سے استدلال بھی کیا جاتا رہا، اسی

ذریعہ سے تجارتی سود کو حلال کیا گیا، معجزات کا انکار کیا گیا، پردہ کا انکار کیا گیا، اور بہت سے مغربی نظریات کو سند جواز دی گئی۔

ان کے بعد نظریۂ انکار حدیث میں اور ترقی ہوئی اور یہ نظریہ کسی قدر منظم طور سے عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا، اور یہ ایک فرقہ کا بانی تھا جو اپنے آپ کو ''اہل قرآن،' کہتا تھا، اس کا مقصد حدیث سے کلیۃً انکار کرنا تھا، اس کے بعد اسلم جیراج پوری نے اہل قرآن سے ہٹ کر اس نظریہ کو اور آگے بڑھایا، یہاں تک کہ غلام احمد پرویز نے اس فتنہ کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے ایک منظم نظریہ اور مکتب فکر کی شکل دیدی، نوجوانوں کے لئے اس کی تحریر میں بڑی کشش تھی اس لئے اس کے زمانہ میں یہ فتنہ سب سے زیادہ پھیلا (درس ترمذی بلفظہ ص۲۶ ج۱، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ)

روشن خیالی

پہلے زمانے میں سازشوں کا طریقۂ کار سیدھا سادہ ہوا کرتا تھا کہ وہ دور ہی سادگی اور نسبۃً کم فریب کاری کا تھا اب جبکہ فاسٹ ٹیکنالوجی کمپیوٹرائزڈ نظام اور سرخی پوڈر کا جدید زمانہ آچکا، ملمع سازی کا دستور عام ہو گیا مکرو فریب کے نئے نئے طریقے سامنے آگئے تو اغیار نے اسلام کے خلاف اپنی سازشوں کو بھی بظاہر خوبصورت اور درحقیقت انتہائی خطرناک شکل دیدی، اس کا نام ہے ''روشن خیالی'' بظاہر یہ نام کتنا پیارا ہے کہ اس کے حرف حرف سے علم کے قطرے ٹپکتے ہیں لیکن اس کے پیچھے جو محرکات ہیں وہ انتہائی بھیانک نتائج کے غماز

ہیں۔

اس لفظ کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو ایرانیوں کیلئے مزدک (پیدائش ۴۸۷ع) نے تجویز کیا تھا جس میں مال وزن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا تھا، یہ اس فلسفہ پر مبنی تھا کہ کسی کی خواہش اور ضرورت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے زرتشت کا قانون بھی اسی کے قریب تھا۔

نوجوانوں اور عیش پسندوں نے مزدک کی تحریک کا پرُ جوش خیر مقدم کیا تھا طرُفہ تماشایہ کہ شاہ ایران قباد نے اس کی سرپرستی قبول کرلی تھی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی تھی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی تھی اور پورے کا پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا تھا۔

روشن خیال یہ چاہتے ہیں کہ اہل اسلام کی زندگی جن اصول و ضوابط کی پابند ہے، ان پابندیوں کو توڑ کر مسلمانوں کو آزاد کرلیا جائے تا کہ وہ اپنی مرضی پر چلیں بظاہر یہ ایک اچھا اقدام ہے مگر مرضی کو اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو مذہبی اقدار کا رشتہ ان سے کب تک چمٹا رہے گا؟

کیا اس کا تجربہ یہود و نصاریٰ کرکے اپنے مذہب پر قائم رہ سکے؟ کہ اب اس نسخے کو مسلمانوں پر آزمایا جارہا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے یہ آزمایا ہوا مجرب ہلاکت خیز نسخہ اب مسلمانوں کی بربادی کے لئے تجویز کیا ہے کہ وہ تو ڈوبے ہیں اپنی ہمراہی میں ہمیں بھی ڈبونا چاہتے ہیں۔

اسلام میں اجتہاد و استنباط کو ہر زمانہ میں بنظر تحسین دیکھا گیا ہے مگر یہ کام

جتنا مفید ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے اس کی مثال دو دھاری تلوار کی مانند ہے نا تجربہ کاروں کے ہاتھوں میں اسکو تھمانا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ ’’اہل تجدد‘‘ اسلام کی قدیم ہیئت ترکیبی پر خوش نہیں وہ چاہتے ہیں کہ اس نئے زمانے میں جہاں پرانی اشیاء ردی کے ٹوکرے میں ڈالی جاتی ہیں وقت کا تقاضا ہے کہ اگر اسلام کو ماننا بھی جائے تو کم از کم اس کی مرمت اور ملمع سازی تو کی جائے تا کہ وہ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے ورنہ اسے کون مانے گا؟

اس نظریئے کا آغاز اس وقت ہو چکا تھا جب انگریز ہندوستان میں اپنے ہمراہ بہت کچھ لایا تھا آیئے اس کا کچھ احوال جناب غامدی صاحب کی زبانی سنتے ہیں۔

دبستان شبلی

جناب غامدی صاحب نے اپنے رسالہ اشراق کے مارچ ۲۰۰۸ والے شمارے میں ’’دبستان شبلی‘‘ کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے جس کے بعض حصے نذر قارئین ہیں وہ لکھتے ہیں۔

’’۱۸۵۷ء جہاں ہماری تاریخ کا وہ سال ہے جس میں ہمارے اقبال کا آفتاب اس برصغیر میں غروب ہوا وہاں ایک دوسرا آفتاب اس سال میں مطلع امت پر طلوع بھی ہوا۔ یہ مولانا شبلی کا سال پیدائش ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول وہ ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے ہنگامۂ مغرب میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے یہ انہی کا دور ہے جس میں مغربی تہذیب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا اور اس کے نتیجے میں امت دو گروہوں میں بٹ گئی، ان میں سے ایک گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول و مبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن و سنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی

تہذیب اور اس کے علوم اس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھہریں، اس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوھی، محمود الحسن دیوبندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک حق و باطل کا معیار یہی تہذیب اور اس کے علوم قرار پائے۔ ان کا سرخیل وہی بڈھا تھا جس کے بارے میں خود شبلی نے کہا تھا۔

پیری سے کمر میں اِک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

شبلی ان دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت کے بانی ہوئے، اس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے، ایک یہ کہ ہمارے لئے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اس دور میں پہنچ جائیں جب قرآن اتر رہا تھا اور جب خدا کا آخری پیغمبر خود انسانوں سے مخاطب تھا، اور دوسرا یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اسی طرح آشنا رہیں، جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی یہ سب اسی جماعت کے اکابر ہیں میں اسے ''دبستان شبلی'' کہتا ہوں اقبال بھی زیادہ تر اسی دبستان سے متعلق رہے.........

سید سلیمان ندوی اگرچہ شبلی کے جانشین ہوئے لیکن حق یہ ہے کہ وہ پہلے گروہ (دیوبندی) ہی سے متعلق تھے چنانچہ انہوں نے عملا اس حقیقت کو اس طرح ثابت کیا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی بیعت کرلی عبدالماجد دریابادی کے بارے میں بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید اسی جماعت سے تھے لیکن ان کی داستان

حیات یہی ہے کہ دانش گاہ الحاد سے نکلے اور سیدھے تھانہ بون کی خانقاہ میں پہنچ گئے، ابوالکلام اس دور کے عبقری تھے...... ابوالاعلی عالم بھی تھے اور صاحب طرز انشا پرداز بھی، وہ ان کے بعد اس شان سے اس راہ پر چلے کہ ہر شخص نے یہی خیال کیا کہ اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے................ اس دبستان میں جس شخص کو امام العصر کہنا چاہیئے وہ تنہا حمید الدین فراہی ہیں......

امین احسن اصلاحی اسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں وہ اپنے استاذ سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے.......... سید سلیمان ندوی کے خلف ابوالحسن علی (ندوی) ہیں مگر وہ انہی کی طرح اب ندوہ سے زیادہ دیوبند میں ہیں۔

اب اس وقت دیکھئے، پہلے گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ اس کی مثال اب اس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی دوسرا گروہ اگر چہ ابھی شرف واقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ پرانی ضلالتوں کی طرح یہ ضلالت بھی کچھ عرصے کے بعد اس کے صفحات ہی میں باقی رہ جائے گی، آنے والے دور کی امامت ''دبستان شبلی'' ہی کے لئے مقدر ہے تاریخ کے مرسح پر اب پس پردہ اسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے۔

(ماہنامہ اِشراق ص ۲ تا ص ۵ مارچ ۲۰۰۸)

اس طرح دبستان تو ہندوستان میں اور بھی پیدا ہوئے مگر علمی سرمایہ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی زیادہ تر سرگرمیاں ماند پڑ گئیں' وہ کوئی علمی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے ہیں بس چند معلومات کے ساتھ خرافات ملا کر ملاوٹ اور

جعلسازی میں مصروف عمل ہیں وہ صرف جدید معلومات کے بل بوتے پر تحقیق کے مدعی بن گئے ہیں جس سے وہ عوام کو تو گمراہ کرسکتے ہیں لیکن اہل علم پر ان کا کچھ اثر نہیں چلتا منکرین حدیث ہوں یا جماعت المسلمین، غیر مقلدین میں سے کم علم رکھنے والی شخصیات ہوں یا پھر روشن خیال طبقے کے دیگر افراد یہ لوگ اسلاف پر لعن طعن اور سب وشتم کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، ستم یہ کہ ان میں سے بعض ایک ہی موضوع پر ریسرچ و تحقیق کرکے عقل کل کے مدعی بن جاتے ہیں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی مثال آپ کے سامنے ہے وہ کوئی عالم نہیں بلکہ ڈاکٹر ہیں انہوں نے مذاہب کے مابین موازنہ اور اسلامی اصول کی ترجیح کا ملکہ حاصل کیا ہے اور یقینا یہ ایک قابل قدر خدمت ہے ہم اس پر ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں تاہم ان کا مسائل بیان کرنا ان میں اپنی ترجیحات بیان کرنا نہ صرف ایک خطرناک اقدام ہے بلکہ اپنے دائرہ قدرت سے اندھا و احمقانہ تجاوز ہے، جیسے ایک لوہار کا کام انسانی اعضاء کی پیوند کاری نہیں اسی طرح ایک ڈاکٹر کا کام بھی مسائل تجویز کرنا نہیں وہ صرف علاج معالجہ میں مستند ہوتا ہے مسائل میں اسے علما کی تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان جیسے لوگ مسائل بیان کرنے اور فتویٰ دینے سے اجتناب برتنا شروع کریں گے۔ لیکن جناب غامدی صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے آخری پیرا گراف میں جو بات صاف صاف لکھی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے گروہ (دیوبندیوں) کے دن گنے جاچکے ہیں اب نیا دور انہی کا ہے۔

غامدی صاحب کی یہ بات انتہائی خطرناک نتائج کی جانب اشارہ کرتی ہے، اس کا ایک مطلب تو یہ لیا جاسکتا ہے کہ روشن خیالی عام ہو جائے گی اور رجعت پسندی خود بخود دم توڑ دے گی، دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ''دبستان شبلی''

کا نظریہ پہلے اس لئے اختلافی رہا تھا کہ وہ نامانوس تھا اب جبکہ لوگ اس سے مانوس ہو گئے تو دیگر منکرات کی طرح یہ بھی فروغ پائے گا۔

یہ اندیشہ یقیناً قوی ہے کہ آج دیوبندی مدارس میں مغربی علوم شامل کرنے کی تجاویز تیزی سے گردش کر رہی ہیں اور عملاً تو بعض ان میں سے داخل نصاب بھی ہیں گو کہ نام کی دیوبندیت سدا باقی رہے گی۔

''الحاد اور کج روی مسلم کا شیوہ نہیں''

جناب غامدی صاحب نے جس مشن کی جانب اشارہ کیا ہے اس کی کچھ جھلکیاں تو پہلے ہی آ چکی ہیں مزید اللہ جانے کہ اس کی کیا صورت سامنے آئے گی، ان لوگوں کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے کہ یہ اپنے طور سے ایک معیار مقرر کرتے ہیں جس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اہل یورپ و مغرب اور مستغربین و مستشرقین کیلئے قابل قبول ہو گو کہ عنداللہ وہ غلط ہی ہو اور چونکہ مغرب کے تقاضے تو بدلتے رہتے ہیں اس لئے ان لوگوں کے اصول بھی ہر وقت تبدیلیوں کی زد پر رہتے ہیں اس کی آسان سی دلیل یہ ہے کہ ایسے نام نہاد محققین کی کتب کا ہر ایڈیشن دوسرے سے اہم باتوں کے حوالے سے مختلف ہوتا ہے اگر ان کے مقصد کے حق میں کوئی حدیث آئے تو اسے دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں ورنہ اسے بلا تکلف رد کرتے ہیں خواہ وہ صحت کے اعلیٰ معیار کے مطابق کیوں نہ ہو بالفاظ دیگر وہ شریعت کو اپنا تابع بناتے ہیں نہ کہ خود کو شریعت کے متبع، جبکہ مسلمان کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ دلیل کی پیروی کرے یہ نہیں کہ اپنی خواہش اور غرض کے مطابق کوئی دعوی کرلے اور پھر اس پر دلیل

ڈھونڈے جو ملے تو لے لیا جائے اور جو مخالف ہو تو اسے رد کردے، چنانچہ مشہور محقق عالم ابن الجوزی المتوفی ۵۹۷ ھجری اپنی کتاب ''صید الخاطر'' میں لکھتے ہیں ''**وانما ینبغی للانسان ان یتبع الدلیل لا ان یتبع طریقاً و یتطلب دلیلھا**'' (ص ۱۹ دار الفکر بیروت) یعنی ہونا یہ چاہیئے کہ آدمی دلیل کی پیروی کرے یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی راستہ بنائے اور طریقہ ایجاد کرے اور پھر اس کی دلیل ڈھونڈنے میں لگ جائے۔

اس کی بے شمار مثالیں ہیں مثال کے طور پر جناب غامدی صاحب نے اپنی سوچ کے مطابق جمع قرآن اور قرأت کی ایک صورت متعین کرلی ہے پھر جو روایات بظاہر اس سے متصادم نظر آئیں انہیں بے دردی سے مسترد کردیا حالانکہ ''سبعۃ احرف'' والی حدیث متواتر ہے اور ایک سو ساٹھ طرق سے زائد اس کی اسانید ہیں جیسا کہ کتاب میں آپ پڑھیں گے اسی طرح حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنھما کی جمع و تالیف قرآن کی روایات صحیح ہیں لیکن انہوں نے ان کو رد کردیا ہے۔

اسی طرح جناب مودودی صاحب نے رسائل مسائل ص ۵۷ طبع ۱۳۵۱ ھج، میں خروج دجال کی احادیث کا انکار کیا ہے جبکہ وہ روایات بھی متواتر ہیں پھر (۵۱ ھجری) والے ایڈیشن میں اسے نبی علیہ السلام کا گمان قرار دیا ہے اور سن ۵۵ ھجری کے ایڈیشن میں اسے آپ علیہ السلام کی رائے اور قیاس کہا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی دلیل کے پیرو کار نہیں بلکہ اپنے خود ساختہ معیار پر کاربند رہتے ہیں معجزات میں تاویل اور بعض دفعہ انکار کرنا تو عام سی بات ہے۔

ایں راہ کہ تو می روی بتر کستان است

یہ طرز استدلال غلط ہونے کے ساتھ انتہائی تباہ کن بھی ہے کیونکہ ایک جھوٹ کیلئے متعدد جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور بالآخر آدمی کذّاب ہی بن کر رہ جاتا ہے کیونکہ جس طرح نیکی، نیکی کے لئے جالب ہے اسی طرح بدی، بدی کے لئے جاذب ہے اس کی ایک آسان سی مثال یہاں پیش کی جاتی ہے عقلمند خود اس سے نتیجہ اخذ کر سکیں گے اور عنداللہ ثواب کی طمع رکھنے والے اپنی طرز زندگی کو سنوارنے میں عبرت حاصل کر سکیں گے۔

جناب پروفیسر منور احمد ملک سابق نائب امیر جماعت احمدیہ ضلع جہلم، ۱۹۹۹ء میں قادیانی مذہب سے توبہ تائب ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں، انہوں نے بچپن، طالب علمی کا زمانہ اور مابعد کا ایک طویل دور قادیانی مذہب کی تائید اور پرچار میں صرف کیا ہے اللہ نے اپنے فضل سے ان کو اس لعنت سے نجات عطاء فرمائی ہے۔

وہ غلام احمد قادیانی کے دعاوی کے بارے میں ایک طویل حقائق کشا مضمون لکھ چکے ہیں یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''غلام احمد قادیانی نے پہلے چودھویں صدی کے مجدد کا دعوی کر دیا، اور ایک حدیث تلاش کرلی کہ ہر صدی کے سر پر ایک مجدد آئے گا، اس دعوے سے کچھ لوگ ان کے مزید قریب ہوگئے اور چند لوگ پیچھے ہٹ گئے جبکہ ایک اعتراض شروع ہوا کہ چودھویں صدی کا مجدد تو امام مہدی ہو گا...... تو مرزا صاحب نے ''ڈیمانڈ'' پوری کرتے ہوئے امام مہدی کا دعویٰ بھی کر دیا۔ اس

کے ساتھ ہی باقاعدہ جماعت بنانے کے لئے لوگوں کو مزید اکٹھا کرنے اور پابند رکھنے کے لئے 1889ء میں بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا...... اب اعتراض یہ ہونے لگا کہ امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا زمانہ تو ایک ہی ہو گا تو عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں؟ اس ''ڈیمانڈ'' کو پورا کرنے کیلئے اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور ان کی قبر سری نگر (کشمیر) میں محلہ خانیار میں ہے اور ایک حدیث تلاش کر لی کہ ''حضرت عیسیٰ کے سوا مہدی نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضرت عیسیٰ ہی امام مہدی ہیں اور وہ درجنوں حدیثیں نظر انداز کر گئے جو ان دونوں کو الگ الگ پیش کر رہی ہیں۔ اب دعویٰ یوں بنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہیں اور جس عیسیٰ کے آنے کی پیشگوئی ہے وہ اصل میں مثیل عیسیٰ ہوں گے چنانچہ میں عیسیٰ کا مثیل ہوں، میں ہی امام مہدی ہوں اور میں ہی مسیح موعود ہوں، اس طرح بحث، مناظروں اور تقاریر و تحریر کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس عرصہ میں وہ ختم نبوت کے قائل تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان ''لانبی بعدی'' کا یہی مطلب لیتے تھے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں...... علماء نے یہ اعتراض کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو نبی اللہ تھے اور آپ ایک امتی، پھر آپ کیسے ان کے مثیل بن سکتے ہیں؟ اس اعتراض کو کافی عرصہ برداشت کیا...... اور پھر مجبوراً اس ''ڈیمانڈ'' کو پورا کرنے کا پروگرام بنایا اور بہت بڑا قدم اٹھاتے ہوئے 1902ء میں ''امتی نبی'' کا دعویٰ کر دیا، اور ختم نبوت کی نئی نئی تاویلیں شروع کر دیں اور قرآن کی آیات کے نئے معنی ایجاد کئے حالانکہ 1835ع تا 1902ع (67 سال) قرآن مجید کی ان آیات کا ترجمہ معمول کے مطابق رہا مگر 1902ع میں یکسر اس کے معنی بدل گئے۔

("ثبوت حاضر ہیں" ص ۸۴ ج ۱)

اس راستہ کے خطرات اتنے نمایاں ہیں کہ کسی صاحب بصارت اور مالک بصیرت کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہونی چاہئے البتہ جو آدمی اپنی عاقبت سے غافل ہو یا تغافل برت رہا ہو اسے یا تو بزور طاقت روکا جاسکتا ہے جو خیر خواہی کا طریقہ ہے یا پھر عدم قدرت اور مایوسی کے عالم میں اسے آزاد چھوڑا جا سکتا ہے جو مجبوری کا راستہ ہے اب جو پسند ہو اسے اپنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ زور چلانا حکومت وقت کا کام ہے لیکن جب حکومت بے علم اور بے حس لوگوں کے پاس ہو تو ہم دوسرا راستہ اختیار کئے بغیر کیا کر سکتے ہیں۔

اغیار کی یاری اچھی نہیں

جو لوگ اہل مغرب کو خوش کرنے کیلئے نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں وہ خود سوچیں کہ اسلام سے بے وفائی کرنے والے اور اپنی جیبیں بھرنے والے کہاں گئے، یہ لوگ اگر اسلام کی خیر خواہی کے جذبے سے یہ کام سرانجام دے رہے ہیں تو انہیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس طرح نئے نئے فرقے بنا کر مسلمانوں کی تقسیم در تقسیم سے اسلام کی کونسی خدمت کی جاسکتی ہے، اس طرح تو اسلام بکھر جائے گا اگر ہم بے جا تحقیقات کے بجائے عمل پر توجہ دیں تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، جیسا کہ قادسیہ کی جنگ کے موقع پر فجر کی نماز کی اذان سن کر فوجی سردار اپنے لشکریوں کے ساتھ نماز کیلئے اس طرح دوڑتے کہ زمین ہل جاتی ایرانی سپہ سالار رُستم نے جب یہ دیکھا کہ ایک روحانی آواز پر لشکر اس قدر جلد جمع ہو جاتا ہے تو بول اٹھا کہ عمر میرا کلیجہ کھا گیا، اور

ایرانیوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک ان میں یہ وفا، یہ صداقت یہ اصلاح اور یہ مواخات ہے یہ لوگ شکست نہیں کھا سکتے۔

درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے

آج کل نئے محققین اور اسکالروں کے نام پر بہت سے لوگ معروف و مشہور ہیں ان کی تعداد شمار سے باہر ہے تاہم انکے مزاج میں بہت سی اشیا قدر مشترک ہیں ان میں سے ایک اہم خصوصیت عقل کل کا دعوی اور امت کے آئمۂ فقہ و نجوم علم اور محدثین و مفسرین کی طرف جہالت کی نسبت کرنا ہے، یہ وہ چیز ہے جس سے انکی سر گرمیوں کے اغراض و مقاصد کا پتہ چل سکتا ہے کہ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے، کیونکہ اس طرح بدگمانیاں پھیلانے سے کہ فلاں آیت کا مطلب اب تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکا اور فلاں حدیث کا مقصد اب تک پوری امت غلط سمجھی ہے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم ان واسطوں اور کتب کو چھوڑ کر براہ راست قرآن سے استنباط شروع کریں پھر اپنے تدبر و غور و خوض سے جو نتیجہ اخذ کیا جائے گا وہی مراد آیت اور مطلب حدیث کہلائے گا، ظاہر ہے کہ یہ چیز گمراہی کو جنم دیتی ہے۔

جناب غامدی صاحب نے جس خاندان اور شجرہ کا ذکر کیا ہے اس میں وہ خود بھی ہیں اور جناب مودودی صاحب بھی، جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (عبادت، دین) کے وہ اصل معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت

کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کیلئے ''اِلٰہ'' اور ''رب'' اور ''دین'' اور ''عبادت'' کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتبِ لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے، (مودودی صاحب کی حیات و افکار ص ۲۶، ص ۲۵ بحوالہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۱۲)

جناب غامدی صاحب تو ان سے بھی چند قدم آگے نکل گئے اور خبر واحد کی حیثیت یکسر مٹادی حتیٰ کہ اس سے سنت کا ثبوت بھی نہیں مانتے چنانچہ وہ ''اصول و مبادی'' کے اخیر میں ''مبادی تدبر سنت'' کا ساتواں اصول ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں ''ساتواں اصول یہ ہے کہ جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی (ص ۶۷)

عجیب جرأت و جسارت ہے کہ امت کے ان ستونوں کو ہلا کر رکھ دیا جن کی محنتوں پر اجتہاد کی عمارت قائم ہے ان علماء کی گمنام شخصیتوں میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے صرف تین دنوں میں قرآن حفظ کرلیا ہے، ان میں لاکھوں احادیث یاد رکھنے والے بھی ہیں اور لاکھوں مسائل مستنبط کرنے والے بھی، ان میں لاکھوں لغات اور ہزاروں کی تعداد میں قصائد ازبر کرنے والے بھی ہیں اس امت کے علماء کی تو نظیر نہیں ملتی، ان کو بے تکلف جاہل قرار دینا اور ان کی ضرورت سے بے اعتنائی برتنا بلکہ دوسروں کو اس کی تلقین اور وصیت کرنا ہرگز خلوص نیت کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے جب اپنے تدبر کو معیارِ حق بنایا اور تدبر تو
ہر آدمی کا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے تو ان کے اس چھوٹے سے خاندان میں
کئی جماعتوں نے جنم لیا، چنانچہ ایک اصول کی بناء پر جناب غامدی کے استاذ جناب
امین احسن اصلاحی صاحب جناب مودودی صاحب سے ناراض ہو کر 1957ء میں
مستعفی ہوئے جس کا تذکرہ انشاءاللہ اسی اصول کے ضمن میں کیا جائے گا، ڈاکٹر
اسرار صاحب الگ ہوگئے، جناب صلاح الدین مدیر تکبیر بھی علیحدہ ہوگئے تھے
اور جناب غامدی صاحب اب اپنے تدبر کے مطابق ایک نئے مذہب کے اصول و
مبادی وضع کرنے میں مصروف عمل ہیں، انکے علاوہ بھی بہت سے نظریات وافکار
پائے جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ آئمہ کے بنائے ہوئے اصول کو اپناتے
اور انہی کے مطابق استنباط اور استخراج کرتے، اس طرح ان کی مساعی بھی مشکور
ہوتیں اور امت تفریق و تقسیم سے بھی محفوظ ہوجاتی۔

تحقیق یا تلفیق

یہ لوگ تحقیق کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی کتب کا مطالعہ
کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تلفیق کرتے ہیں جو تحقیق سے
بالکل مختلف چیز ہے، تلفیق یہ ہے کہ کسی عمل یا معاملہ میں مختلف فقہا کے اقوال
کو یکجا کرکے نئی صورت بنالی جائے یہ کام تو ذاتی عمل میں بھی جائز نہیں چہ
جائے کہ اس معجون کا فتوی مرتب کیا جائے یا کتاب لکھی جائے کیونکہ اس
طرح تو ایک نیا مذہب بن جاتا ہے جو سراسر غلط اور شریعت سے مذاق ہے در مختار
وشامی میں ہے وان الحکم الملفق باطل بالاجماع مختلف مذاہب سے بنایا ہوا حکم

بالاجماع باطل وناجائز ہے۔

(شامی ص ۵۷ ج ا مطبع ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

پوری امتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ سے اختلاف چہ معنی دارد؟

دین اسلام میں استخراج مسائل اور استنباط پر کبھی پابندی نہیں رہی ہے بلکہ اختلاف رائے اس دین کا امتیازی اعزاز ہے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے عہد سے لیکر آج تک اسلام کا صفحۂ تاریخ دنیا کے سامنے ہر وقت کھلا رہتا ہے جو جب چاہے پڑھ لے، لیکن ہمیں دو چیزوں کو مدنظر رکھنا ہوگا، ایک وہ اختلاف جو نیک نیتی پر مبنی اور اصول ودلائل کی روشنی میں ہو دوم وہ جو بدنیتی اور جعلسازی کا نتیجہ ہو۔

قسم اول کی ہمیشہ اسلام میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اس پر اجر وثواب کا وعدہ بھی روایات سے ثابت ہے، جبکہ آخر الذکر اختلاف شریعت میں اس لئے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ اول تو اس سے کوئی فائدے کی توقع نہیں کی جاتی دوم اس سے اہل اسلام میں ذہنی انتشار، باہمی نفرت اور بدانتظامی کا قوی امکان جنم لیتا ہے جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدۂ عام کیا جاسکتا ہے۔

جناب غامدی صاحب نے ''اصول ومبادی'' میں چند ایسے نظریات واقوال کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو امت کے متفقہ اصول اور اجتماعی سوچ کے منافی ہیں، انہوں نے متعدد ایسی چیزوں کا انکار کیا ہے جن پر آج تک علمائے امت کا اتفاق رہا ہے یا پھر کسی ایک جہت کے اختلاف کو لیکر غامدی صاحب نے دوسرے پہلو میں سند بنا کر نئی شکل وصورت پیدا کردی۔

وہ اپنی تحریروں سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں ہم اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے تاہم اتنی بات کہنے کا حق ضرور استعمال کریں گے کہ اسلام کے چودہ سو سال پر محیط دور نے جتنے محققین اور آئمہ و محدثین دیکھے ہیں دنیا کی تاریخ اس کی مثال بلکہ نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، انبیاء کرام علیھم السلام کے علاوہ تاریخ کا کوئی صفحہ ایسی ہستیوں کے نام پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

آخر کوئی وجہ تو ہے کہ آج انکی تحقیقات سے منہ موڑنے کی غامدی صاحب تلقین کر رہے ہیں یا کم از کم ان پر اعتراض کر کے یہ باور کرانے کی کوشش فرمارہے ہیں کہ میری بات صحیح ہے اور ان کی غلط، میری مانو! انکی نہ مانو،

اس کی مثال تو وہی ہوئی کہ ایک آدمی دنیا کے سائنسدانوں پر اعتراض کرنے لگے اور لوگوں اور حکومتوں سے کہے کہ انکی تحقیقات و ثمرات ضائع کردیں میں تمہیں ان سے بہتر دینے کو تیار ہوں۔

ہاں کسی کے ذہن میں یہ اشکال گردش کر سکتا ہے کہ اگر کسی کے پاس کسی چیز کا نعم البدل موجود ہو تو اسے قبول کرنے میں کیا حرج ہے؟

یہ بات سو فیصد صحیح ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جن آئمہ کے نام زندہ ہیں اور امت مجموعی حیثیت سے ان کی تقلید پر کمربستہ ہو چکی ہے تو یہ انکی دولت یا حکومت کی وجہ سے نہیں بلکہ انکی تحقیق انیق کی بدولت، انکا جو مقام قابلیت اور ذہانت و دیانت کے حوالے سے مسلم ہے آج کوئی امکان نہیں کہ کوئی شخص اتنا علم حاصل کرے جس سے ان کا مقام پیچھے رہ جائے خاص کر زمانے کے مرور نے اس چیز کو محال بنادیا ہے، لہذا آج اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ محض دعویٰ کی حد تک ہو سکتا ہے اسکی کوئی حقیقت ممکن نہیں اگر

ہے کوئی تو دلیل لائے، اور برہان پیش کریں۔

چنانچہ مشہور زمانہ محقق علامہ بن خلدون اپنے مشہور مقدمہ میں رقمطراز ہیں ''اسلامی ممالک میں لوگوں نے ان ہی چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کی، اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام و نشان بھی نہ رہا لوگوں نے اختلافات مسالک کا دروازہ بند کر دیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہو گئی اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی اور اس لئے بھی کہ ہر کس و ناکس مجتہد نہ بن بیٹھے اس لئے صراحت سے کہہ دیا گیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کیلئے مجبور ہیں۔

ان چاروں اماموں میں سے جس کی چاہیں تقلید کریں، یہ حرام ہے کہ چاروں کی باری باری تقلید کریں، کیونکہ اس طرح تو دین مذاق بن کر رہ جائے گا۔ اب فقہ میں چاروں اماموں کے اقوال بیان کئے جاتے ہیں اور ہر مقلد اپنے امام کے قول پر عمل کرتا ہے جبکہ اصول کی تشریح اور روایت کی سند کو بھی اچھی طرح پیش نظر رکھنا ہے۔

آج فقہ کا بس اتنا ہی مفہوم ہے، اگر آج کوئی مجتہد بن بیٹھے تو اس کے اجتہاد کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور نہ اس کی تقلید پر کوئی آمادہ ہو گا۔

آج دنیا کے تمام مسلمان انہی چاروں کی تقلید کی طرف لوٹ گئے ہیں (مقدمہ ابن خلدون حصہ دوئم مترجم ص ۳۴۳، ص ۳۴۴ نفیس اکیڈمی کراچی)

نتیجہ:

علامہ عبدالرحمن بن خلدون کی شخصیت سے کون ذی شعور اور ذی علم بے خبر ہو گا، ان کی تصنیفات سے آج بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے خصوصا یورپ میں انکی عمرانیات تو متن کی حیثیت کی حامل ہیں ان کا یہ مقدمہ دو جلدوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی مشہور تاریخ کے مبادی کے طور پر لکھا ہے لیکن در حقیقت یہ تمام علوم کا مقدمہ کہلانے کا مستحق ہے، بہر حال علامہ نے مذکورہ بالا عبارت میں کم از کم آٹھ باتیں ایسی کہی ہیں جو بہت قابل غور ہیں۔

(1) ''علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہو گئی''

اس سے یہی معلوم ہو تا ہے کہ اصطلاحات کی کثرت تشویشناک ہے اس لئے تو علمائے وقت کو سدباب کرنا پڑا حالانکہ یہ آج سے سینکڑوں سال پہلے کی بات ہے۔

(2) ''اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی''

اس سے صاف معلوم ہوا کہ اجتہاد کا مقام پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے قرآن و سنت کے جس علم، قدیم عربی کے ہزاروں اشعار یاد کرنے، اور قرآن و سنت کے اصول جاننے، احادیث میں صحیح و سقیم کی پہچان، اور اُن قرائن و علوم پر بھرپور عبور اور مکمل دست رس کی ضرورت ہے جو اجتہاد کیلئے لازمی ہیں آج کی دنیا میں یہ چیز ناممکن ہے اس لئے اس پر اتفاق ہے کہ آج کی دنیا میں بلکہ آئمہ مجتہدین کے بعد اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے گو کہ مجتہد فی المذہب وغیرہ بکثرت پیدا ہوئے آج تو وہ درجہ بھی عنقاء بن گیا ہے، فقہا و مجتہدین کے چھ طبقات شرح عقود رسم المفتی وغیرہ کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(3)...... ''اوراس لئے بھی کہ ہر کس و نا کس متجہد نہ بن بیٹھے''
یعنی اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنے میں دین کے بگاڑ کا قوی اندیشہ ہے کہ اس طرح نا اہل لوگ شریعت کے معاملہ میں رائے زنی کرنے لگ جائیں گے جیسے آج کل ہوتا ہے کہ بہت سے نالائقوں نے مجہتد ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔
(4)...... ''اس لئے صراحت سے کہہ دیا گیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں''
یعنی اجتہاد کے دروازہ بند کرنے پر آج سے سینکڑوں سال قبل اجماع منعقد ہو چکا ہے۔
(5) و ((6 ان چاروں اماموں میں سے جس کی چاہیں تقلید کریں یہ حرام ہے کہ چاروں کی باری باری تقلید کریں''
مطلب واضح ہے کہ کسی ایک امام کی تقلید کا پابند ہونے کے بعد یہ جائز نہیں کہ جو دل میں آجائے اور خواہش جس کو مقتضی ہو وہی اپنایا جائے خواہ وہ کسی کا بھی قول و مذہب ہو۔
(7) ''آج فقہ کا بس اتنا ہی مفہوم ہے اگر آج کوئی مجتہد بن بیٹھے تو اس کے اجتہاد کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔''
بات صاف ہے کہ نئی فرقہ بندی کی دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔
(8) ''آج دنیا کے تمام مسلمان ان ہی چاروں کی تقلید کی طرف لوٹ گئے ہیں''
قابل غور ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان آخر کیوں اس بات پر متفق ہوئے کہ نئی اصطلاحات اور جدید اصول کے بجائے قدماء کے اصول و مبادی کو اپنایا جائے۔
جناب غامدی صاحب اپنی کتاب ''اصول و مبادی'' کے شروع شروع میں دین کی تعریف اور پس منظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں یہی قانون حکمت وہ دین حق ہے جسے

''اسلام'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ماخذ کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے۔

(1) ''قرآن مجید'' (2) ''سنت''

المسترشد: جناب غامدی صاحب دین کے مأخذ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تواتر قولی و عملی اور اجماع صحابہ کی وہ شکل بنیاد قرار دیتے ہیں جو قرآن و سنت کی صورتوں میں ہم تک پہنچی ہو۔

اس عبارت میں دو باتیں بڑے واضح انداز سے کہی گئی ہیں پہلی یہ کہ دین صرف وہ ہے جو تواتر قولی و عملی اور اجماع صحابہ سے ثابت ہو دوسری یہ کہ قرآن کی طرح سنت متواترہ دین ہے باقی کوئی چیز دین نہیں۔

چونکہ جناب غامدی صاحب منطق اور فلسفہ کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ انہی کے ذوق کے مطابق بات کی جائے، یہ بات تو فقہا و علما میں بھی متفقہ اور اجماعی ہے ہی کہ نصوص کے علاوہ مفہوم مخالف معتبر ہے لہٰذا اس کی روشنی میں بھی ان کی عبارت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو چیز تواتر قولی و عملی اور اجماع صحابہ سے ثابت نہ ہو تو وہ دین نہیں ہے مگر اس کے ساتھ منطق کے اصول کے تناظر میں بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ ان کی اس عبارت میں چار تقابلات میں سے تقابل ایجاب و سلب ہی بن سکتا ہے اور مناطقہ کے نزدیک ایجاب و سلب میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی چیز یا انسان ہو گی یا انسان نہیں ہو گی یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز موجود تو ہو مگر وہ انسان بھی نہ ہو اور غیر انسان بھی نہ ہو لہٰذا اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی شے یا دین ہو گی یا نہیں ہو گی چونکہ

دین تو صرف وہی ہے جو تواتر عملی و قولی اور اجماع صحابہ سے ثابت ہو تو اس کا مفہوم مخالف اور سلب یہ ہوا کہ جو چیز بیک وقت ان تینوں سے ثابت نہ ہو تو وہ دین نہیں بلکہ وہ خود اگلے صفحے پر تصریح کرتے ہیں ''ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے'' (ص۱۱) لہذا ہم جناب غامدی صاحب سے مندرجہ ذیل چند اشیاء کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ آیا یہ دین ہیں یا نہیں چونکہ ان میں اجماع کی شرط نہیں پائی جاتی لہذا یہ دین سے خارج ہوں گی۔

مثلاً اذان میں ترجیع، اقامت کے کلمات کی تعداد، ظہر کی نماز کا وقت کب ختم ہوتا ہے، عشاء کی نماز کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟ اشراق کی نماز، چاشت کی نماز، شب و روز میں سنن مؤکدہ نمازوں کی تعداد، جمعہ کے دن سنن کی تعداد، وتر نماز کی رکعتوں کی تعداد، تہجد کی نماز کی رکعتوں کی تعداد، نماز میں رکوع کے وقت رفع یدین، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا، قیام میں ہاتھ باندھنا یا نہ باندھنا، باندھنے کے بعد کس جگہ پر رکھنا، قعدے کی صورت میں بیٹھنے کی ہیئت، تشہد کے کلمات، رکوع کی حالت میں تطبیق، نماز میں سلام پھیرتے وقت سلام کی تعداد، سورج گرہن میں نماز میں رکوع کی تعداد، تراویح نماز کی رکعتوں کی تعداد، عید کی نماز میں تکبیرات کی تعداد، عید کے دن عید گاہ میں یا گھر اور مسجد میں نفل پڑھنا، زیورات پر زکوٰۃ، سائمہ گھوڑوں پر زکوٰۃ، یتیم کے مال پر زکوٰۃ، مال مستفاد پر زکوٰۃ، شہد پر زکوٰۃ، زمین کی پیداوار جب پانچ وسق سے کم ہو تو اس پر عشر، مخلوط جانور جو اجتماعی صورت میں نصاب تک پہنچتے ہوں پر زکوٰۃ غریب آدمی پر صدقۃ الفطر وغیرہ وغیرہ ایسے بے شمار مسائل ہیں کہ اگر ان کو یکجا کیا جائے تو کئی جلدیں بن سکتی ہیں یہ سب وہ صورتیں ہیں جو تواتر عملی

و قولی اور صحابہ کے اجماع سے ثابت نہیں لہذا یہ سب دین سے خارج ہونی چاہئے پس جو آدمی ان پر عمل کرے اس کا حکم کیا ہو گا؟ وہ مرتکب گناہ ہو گا یا وہ امر مباح پر عمل کرنے والا قرار پائے گا؟

تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت ساری ایسی اشیاء جو قطعی اور متواتر ہیں انکو جناب غامدی صاحب نے دین کی فہرست میں جگہ نہیں دی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

''اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے: عبادات ((1 نماز ((2 زکوٰۃ اور صدقۂ فطر ((3 روزہ و اعتکاف ((4 حج و عمرہ ((5 قربانی اور ایام تشریق کی تکبریں، معاشرت: (1) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات ((2 حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب، خورد و نوش: (1) سُورَ، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کئے گئے جانور کی حرمت: (2) اللہ کے نام لے کر جانوروں کا تذکیہ

رسوم و آداب: (1) اللہ کا نام لے کر دائیں ہاتھ سے کھانا پینا ((2 ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' اور اس کا جواب ((3 چھینک آنے پر ''الحمد للہ'' اور اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' (4) نو مولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت ((5 مونچھیں پست رکھنا ((6 زیر ناف بال کاٹنا ((7 بغل کے بال صاف کرنا ((8 بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا ((9 لڑکوں کا ختنہ کرنا ((10 ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی ((11 استنجا ((12 حیض و نفاس کے بعد غسل ((13 غسل جنابت ((14 میت کا غسل ((15 تجہیز و تکفین ((16 تدفین ((17 عید الفطر ((18 عید الاضحیٰ (اصول و مبادی ص ۱۱ و ص ۱۰)

المسترشد: دیکھئے اس میں اذان صلوٰۃ، وضو، مسواک، سر چھپانے، روبہ قبلہ نماز پڑھنے، کپڑوں کی صفائی رکھنے، سود وربوا کی حرمت یا دیگر معاملات اور اخلاقیات وعقائد وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں اگر جناب غامدی صاحب یہ کہیں کہ نماز وغیرہ میں یہ سب شامل ہیں تو ہمارا سوال وہی ہے کہ نماز میں تو بہت ساری اشیاء غیر اجماعی اور غیر متواتر ہیں بلکہ خود نماز وغیرہ کی بہت ساری اقسام غیر اجماعی اور غیر متواتر ہیں پھر تو آپ نے غیر دین کو دین میں شامل کر دیا اس کا کیا کیجئے گا؟ نیز یہ تمام چیزیں کلمہ میں داخل ہیں پھر تو واحد کلمہ کو دین کہنا چاہئے۔

اور دیانت و تحقیق کی انتہاء کا عالم یہ ہے کہ اس میں مونچھوں کے پست رکھنے کا ذکر تو کیا مگر عطر لگانے اور داڑھی بڑھانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا حیا اور حنا یعنی بالوں پر مہندی لگانے کا کوئی نام ونشان نہیں حالانکہ یہ بھی تو سنن مرسلین اور ملت ابراہیم میں سے ہیں، تعجب کی بات ہے کہ داڑھی نہ صرف ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت ہے بلکہ تمام انبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام کی متفقہ سنت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے بغیر تجدید واصلاح اور بلا اضافہ جاری فرمایا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت وسنت میں یہ واحد سنت تھی جو بعینہ جوں کی توں باقی تھی متواتر بھی تھی اور اجماعی بھی بلکہ سارے عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی اس پر عمل پیرا تھے پھر کیا وجہ ہے کہ مونچھوں کو پست رکھنے کو دین میں شمار کیا گیا اور داڑھی کو سنت زائد وعادیہ کے زمرہ میں ڈالا گیا؟ کیا وہ اس قابل بھی نہ تھی کہ اسے اپنی کتاب میں جگہ دیتے؟

کیا چھینک آنے پر الحمدللہ کہنے اور جواب میں یرحمک اللہ، نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت تواتر قولی سے ثابت ہیں؟ کیا ابراہیم

علیہ السلام کی ملت میں یہ سب چیزیں شامل تھیں اور تواتر قولی و عملی سے ہم تک پہنچی ہیں؟ اسی طرح عید الفطر ملت ابراہیمی سے ہم تک تواتر سے پہنچی ہے؟ کیا ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں صدقۂ فطر اور رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف تھا اور تواتر سے ثابت ہے؟ حیض اور نفاس یا استحاضہ کے خون کی مدت تواتر سے ثابت ہے؟ تواتر تو کجا بلکہ کسی صحیح روایت سے بھی ثابت ہے؟ غامدی صاحب نے دین کی فہرست میں جہاد کا کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ وہ متواتر ہے اور نبی علیہ السلام و صحابہ کرام کی زندگیوں کا بیشتر حصہ اسی میں گزرا ہے آخر آپ کونسا دین بنانا چاہتے ہیں؟

سنت کیا ہے؟

جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے''(اصول و مبادی ص ۱۰)

المسترشد ہم پہلے سنت کے لغوی و اصطلاحی معنی ذکر کرتے ہیں تاکہ قارئین کو سمجھنا آسان ہو پھر غامدی صاحب کے کلام کے رموز و اشارات کی جانب آتے ہیں۔

لغت میں سنت کے متعدد معنی ہیں، خصلت، طریقۂ خاص، طبیعت، شریعت، ضابطہ، سیرت، فطرت، مزاج و عادت، چہرہ اور شکل و صورت وغیرہ سب پر سنت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

سنت کے اصطلاحی معنی کے بارے میں السید الشریف الجرجانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں ”وفی الشریعۃ ھی الطریقۃ المسلوکۃ فی الدین من غیر افتراض و وجوب“ فالسنۃ ما واظب النبی صلی اللہ علیہ وسلم علیھا مع الترک احیاناً، فان کانت المواظبۃ المذکورۃ علی سبیل العبادۃ فسنن الھدیٰ و ان کانت علی سبیل العادۃ فسنن الزوائد“ فسنن الھدٰی مایکون اقامتھا تکمیلاً للدین وھی التی تتعلق بترکھا کراھۃ أو اسأۃ، و سنۃ الزوائد ھی التی أخذھا ھدیٰ ای اقامتھا حسنۃ ولا تتعلق بترکھا کراھۃ ولا اساءۃً، کسیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قیامہ وقعودہ ولباسہ وأکلہ“

یعنی شریعت کی اصطلاح اور عرف میں سنت دین کے اس معروف طریقہ کو کہتے ہیں جو فرض اور واجب کے علاوہ ہو، پس سنت وہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مداومت اور ہمیشگی فرمائی ہو، تاہم کبھی کبھار اسے ترک بھی فرمایا ہو، تو اگر یہ مواظبت و ہمیشگی از روئے تشریع اور عبادت کے طور پر ہو تو ایسے امور کو سنن ھدیٰ کہتے ہیں (جن کو ہم لوگ اور عام فقہاء سنت مؤکدہ سے تعبیر کرتے ہیں) اور اگر عادت کے طور پر ہو تو ایسے معمولات کو سننِ زوائد کہا جاتا ہے (یعنی غیر مؤکدہ)

علی ھذا سننِ ھدیٰ وہ ہیں جن سے مراد دین کی تکمیل ہو اور ان کے ترک کرنے پر کراہت یا گناہ لازم آتا ہو،

جبکہ سنت زائدہ (غیر مؤکدہ) وہی ہے کہ اس کے کرنے سے نیکی اور ثواب ملتا ہے لیکن اس پر عمل نہ کرنے سے گناہ نہیں ہوتا جیسے حضور علیہ السلام کے اٹھنے، بیٹھنے اور پہننے اور کھانے کے آداب و طریقے ہوئے“ (التعریفات ص

۸۸ مطبع دار المنار)

سنت کے متعلق غامدی صاحب کی رائے

جناب غامدی صاحب نے اس موقعہ پر اپنی جو تحقیق پیش کی ہے اس کا مرجع و مآل تین باتوں کی طرف ہوتا ہے۔

(1) سنت سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل ملت ہے جسکی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجدید واصلاح فرمائی ہے۔

(2) سنت وہ ہے جو امت کے تواتر عملی و قولی اور اجماع سے ثابت ہو۔

(3) سنت کا تعلق تمامتر عملی زندگی سے ہے بشرطیکہ وہ بطور تشریع ہو لہذا آپ علیہ السلام کی عام عادات واحادیث کو سنت نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ وہ پہلی بات کے متعلق لکھتے ہیں سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے الخ جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزر گیا۔

(اصول ومبادی ص ۱۰ طبع دوم ستمبر 2006)

وہ کتاب کے اخیر میں ''حدیث کا متن'' کے عنوان کے تحت سنت کے حوالے سے لکھتے ہیں ''ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح امت کے اجماع سے ثابت ہے یہ بھی اسی طرح امت کے اجماع ہی سے اخذ کی جاتی ہے، سنت سے متعلق یہ حقائق چونکہ بالکل قطعی ہیں اس لئے خبر واحد اگر سنت کے منافی ہے اور دونوں میں توفیق کی صورت تلاش نہیں کی جاسکتی تو اسے لامحالہ رد ہی کیا جائے گا۔''

(اصول ومبادی ص ۷۹ طبع دوم ستمبر 2006)

وہ تیسری بات کی بابت مبادی تدبر سنت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔
پہلا اصول یہ ہے کہ سنت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو، قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اس کا دین پہنچانے ہی کیلئے مبعوث ہوئے تھے، ان کے علم و عمل کا دائرہ یہی تھا، اس کے علاوہ اصلاً کسی چیز سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی (اصول و مبادی ص ۷۲ طبع دوم ستمبر 2006)

یہ تیسری بات اگرچہ بہت خطرناک ہے کہ یہ انکار حدیث کی پہلی لچکدار سیڑھی معلوم ہوتی ہے اور غالباً تیز قوت شامہ رکھنے والے اس سے فتنۂ انکار حدیث کی بدبو ضرور محسوس کرتے ہوں گے تاہم فی الحال ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ ہمارے زیر نظر کتاب ''اصول و مبادی'' میں مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ کوئی ایسی عبارت اب تک نظر سے نہیں گزری ہے جس سے انکی انکار حدیث کے حوالے سے گرفت کی جاسکے مستقبل کا علم اللہ ہی جانتا ہے۔

پہلی بات کا جائزہ

سنت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روایت تک محدود کرنے کا مطلب سمندر کو نہر میں سمونے کے مترادف ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اصول و عقائد میں تمام انبیاء علیھم السلام برابر کے شریک ہیں یعنی اللہ اور اس کی صفات پر ایمان لانے، فرشتوں اور انبیاء و رسولوں پر ایمان لانے، آخرت اور تقدیر وغیرہ پر ایمان لانے کے حوالے سے سب مللِ ساویہ متحد ہیں۔
جہاں تک فروع کا تعلق ہے تو ان میں قوم اور زمانے کی مناسبت سے نسخ

اور رد و بدل کا عمل ہمیشہ سے رہا ہے تاآنکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کا خاتمہ ہوا، بحیثیت مسلمان ہر آدمی کو لازم ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی جانب سے جو کچھ لائے ہیں وہ دین ہے اور ان پر ہمارا ایمان ہے جیسا کہ شرح عقائد وغیرہ کتبِ عقائد میں اس کی تصریح پائی جاتی ہے "**هو التصديق بجميع ما جاء به النبى صلى الله عليه و آله وسلم من عند الله**" یعنی اللہ عزوجل کی جانب سے انہوں نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کی تصدیق کرنا ایمان ہے، خواہ وہ قول ہو یا عمل اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس کی ہرگز اجازت نہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو سابقہ ادیان پر پرکھنے کا کوئی معیار اپنائیں کہ اگر اسلام کی کوئی چیز ادیان سابقہ یا سنت ابراہیمی سے مختلف ہے تو اسے رد کردیں اور جو موافق ہے تو اسے دین سمجھ کر قبول کرلیں وہ الگ بات ہے کہ اسلام ایک جامع ترین مذہب ہونے کی بنا پر سابقہ ادیان کی ہمہ خوبیوں کو شامل ہے، لہٰذا ہمیں بجائے سورج کے چراغ سے موازنہ کرنے کے، چراغ کی روشنی کو سورج کے مشابہ قرار دینا چاہیئے کیونکہ اسلام ناسخ اور کامل ترین مذہب ہے اگر سابقہ ادیان کی کوئی بات اسلام کا حصہ ہے تو صرف اس لئے کہ اسلام نے اس کا حکم کیا ہے یا اس کی تائید کی ہے۔ اس حقیقت کو اُجاگر کرتے ہوئے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ اپنی تفسیر عثمانی میں لکھتے ہیں "شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں اول عقائد (جیسے توحید و نبوت وغیرہ) سو اس میں تو سب دین والے شریک اور موافق ہیں۔ اختلاف ممکن ہی نہیں ہے...... دوسرے قواعد کلیۂ شریعت کہ جن سے جزئیات و فروغ مسائل حاصل ہوتے ہیں اور تمام جزئیات میں وہ کلیات

ملحوظ رہتے ہیں اور ملت فی الحقیقت انہی اصول اور کلیات کا نام ہے، اور ملت محمدی اور ملت ابراہیمی کا توافق و اتحاد انہی کلیات میں ہے...... تیسرے مجموعۂ کلیات و جزئیات و جمیع اصول و فروع (جس کو شریعت کہتے ہیں) جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ایک ہے اور شریعت جدا جدا ہے''۔

(آیت نمبر ۱۳۵ سورۃ البقرہ)

اپنے ہی اصول سے انحراف

جناب غامدی صاحب کی اس روش کی یہ توجیہ ممکن ہے کہ یا تو وہ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں یا پھر اپنے ہی وضع کردہ اصول سے منحرف ہو چکے ہیں۔ جناب موصوف نے اپنی تحقیق کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے، ''ثم اوحینا الیک ان اتبع ملة ابراھیم حنیفاً و ماکان من المشرکین'' پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

(اصول ومبادی ص ۱۰)

ہم جناب غامدی صاحب کی توجہ انہی کے وضع کردہ اصول کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں تاکہ قارئین خود پڑھ کر فیصلہ کرسکیں۔ چنانچہ جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں: ''تیسری چیز یہ ہے کہ حدیث میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کے موقع و محل کو سمجھ کر اس کا مدعا متعین کیا جائے، بات کس وقت کی گئی، کس سلسلے میں کی گئی اور کن لوگوں سے کی گئی، یہ سب چیزیں اگر ملحوظ نہ رکھی جائیں تو نہایت واضح باتیں بھی بسا اوقات لاینحل معما بن جاتی ہیں،

فہم حدیث میں اس اصول کی اہمیت غیر معمولی ہے۔"

(اصول و مبادی طبع دوم ستمبر 2006ء ص ۸۲، ص ۸۱)

اس اصول کی بنا پر جناب غامدی صاحب نے مشہور حدیث "**الائمة من قریش**" کو دین کے مستقل حکم ماننے سے انکار کیا ہے کیونکہ بقول ان کے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد کی سیاسی صورتحال کے لحاظ سے کہی گئی تھی (ایضاً ص ۸۲)

جناب موصوف اسی کتاب میں دوسری جگہ "اسلوب کی ندرت" کے عنوان کے ضمن میں لکھتے ہیں اول یہ کہ اس (قرآن) کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی وہ پس منظر وہ تقاضے اور وہ صورت حال معین کی جائے جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی کوئی سورت نازل ہوئی ہے اس کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ سب چیزیں خود قرآن ہی کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتی ہیں (اصول و مبادی ص ۲۲ طبع دوم ستمبر 2006ء)

ان اصول کی روشنی میں جناب غامدی صاحب سے عرض ہے کہ دین اسلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے کا فلسفہ درحقیقت یہ ہے کہ حضرت اسماعیل بن ابراہیم عربوں کے والد ماجد ہیں جبکہ حضرت اسحق بن ابراہیم علیہ السلام بنی اسرائیل کے جد امجد ہیں اس لئے ہر دو فریق اپنی اپنی نسبت اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے اور دعویٰ کرتے کہ ان کا دین وہی تھا جو ہمارا ہے عرب اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے اور اپنی رسومات کو ملت ابراہیمی سے تعبیر کرتے، اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے کہ حضرت ابراہیم علیہ

السلام عربوں کے دین کے بانی تھے اور یہ کہ ہمارے اور ان کے دین میں کوئی فرق نہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی آدمی اسلام قبول کرتا تو وہ لوگ اسے صابی سے یاد کرتے یعنی مذہب تبدیل کرنے والا۔

دوسری جانب یہود و نصاریٰ اس انتساب میں عربوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے کہ العیاذ باللہ حضرت ابراہیمؑ یہودی و نصرانی تھے۔

پس قرآن نے جابجا ان لوگوں کے دعووٴں کی تردید فرمائی اور ان پر واضح فرمایا کہ اگر وہ اپنے دعووٴں میں سچے ہیں تو ان کو شرک ترک کرکے پکے موٴحد بننا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اتباع و متبعین کے بارے میں اللہ عزوجل نے صاف طور پر ارشاد فرمایا کہ درحقیقت یہی لوگ ملت ابراہیمی یعنی توحید اور دین حنیف کے پیرو ہیں جبکہ باقی لوگ اپنے دعووٴں میں جھوٹے ہیں چنانچہ سورۃ ال عمران میں ارشاد فرمایا: ''**یا اهل الکتاب لِمَ تحاجون فی ابراهیم وما انزلت التوزۃ والا بخیل الامن بعده افلاتعقلون**''

''اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور توریت وانجیل تو اتریں اس کے بعد کیا تم کو عقل نہیں؟''

دوسری بات یہ قابل ذکر ہے کہ یہودیت و نصرانیت دونوں افراط و تفریط کا شکار ہو گئی تھیں یہود مسلسل غلو کی جانب بڑھ رہے تھے اور نصاری تسلسل سے غیر ضروری نرمی و سہولت کی راہیں نکالنے پر عمل پیرا تھے بلکہ ان کی اصل ملتوں میں بھی یہ عنصر پایا جاتا تھا کہ یہود کے ڈھیٹ مزاج کے پیش نظر ان پر سختی

ہی حکمت تھی جبکہ ان کا غلو توڑنے کیلئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملت میں نرمی ہی بہترین علاج ثابت ہو سکتی تھی، اس کے مقابلہ میں عرب ان دونوں مذہبوں سے دور تھے اس لئے ان کو ملت ابراہیمی کے اصول پر ڈالا گیا جو معتدل، سمحاء اور سہل ملت تھی، لہذا کہا جائے گا کہ عقائد تو تمام ساوی ملل کے ایک ہیں جبکہ اصول و کلیات میں ملت ابراہیمی اور اسلام باہمی موافق و متحد ہیں اور پیچھے عرض کیا جاچکا کہ ملت در حقیقت انہی اصول و کلیات کا نام ہے۔

تیسری چیز جو مجموعہ کلیات و جزئیات اور اصول و فروع کا نام ہے اور جسے شریعت کہا جاتا ہے تو اس میں اسلام مستقل طور پر جدُ اگانہ و ممتاز ہے اس لحاظ سے وہ کسی ملت کا تابع نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اجتہاد و استنباط کا جتنا کام دین اسلام میں ہوا ہے کسی اور ملت میں نہیں ہوا ہے، آخر کوئی چیز تو ہے جو اسلام کی شانِ امتیاز ہے، اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ یہ قیامت تک آنے والی انسانیت کی فلاح و کامیابی کا ضامن اور ہر شعبے کا کفیل دین ہے۔

دوسری بات کا جائزہ

جناب غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ سنت صرف وہی ہے جو امت کے تواتر قولی اور صحابہ کرام ؓ کے اجماع سے ثابت ہو، ایک ایسی شرط ہے جو اس سے پہلے امت کے کسی مقتدیٰ شخص نے نہیں لگائی ہے لہذا ایسی سخت شرط عائد کرنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ معدودے چند سنتوں کے علاوہ باقی تمام سنتیں سنت کی فہرست سے خارج ہو جائیں گی۔

بلکہ انہوں نے خود کتاب (اصول ومبادی) کے شروع میں جو لسٹ دین کی

اشیاء کی دی ہے اس میں کل ملا کر بمشکل چالیس چیزیں شمار کی گئی ہیں بلکہ ان میں بھی بعض ایسی ہیں جن پر غامدی صاحب کی مذکورہ تعریف صادق نہیں آتی اور نہ وہ اس شرط کے زمرے میں داخل ہو سکتی ہیں مثلاً نماز کو لیجئے جو انہوں نے سرفہرست شمار کی ہے اس کی رکعات کی تعداد کے بارے میں تواتر عملی تو موجود ہے مگر تواتر قولی کہیں بھی نہیں جبکہ وہ سنت و قرآن کو ثبوت کے حوالے سے ایک ہی گردانتے ہیں یعنی جو اجماع اور تواتر قولی سے ثابت ہو۔

اگر غامدی صاحب کی تواتر کے حوالے سے اپنی کوئی تعریف ہو تو ممکن ہے لیکن اب تک امت کا جس چیز پر اجماع ہے بلکہ تمام مناطقہ و فلاسفہ بھی اس کے قائل ہیں کہ متواتر وہ خبر یا عمل ہے جس کو نقل کرنے والوں کی تعداد ہر زمانے میں اتنی رہی ہو جس کا جھوٹ پر اجتماع عقلاً محال ہو، حالانکہ نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارے میں ایسا کوئی تواتر قولی نہیں ہے۔

جناب غامدی صاحب نے کتاب کے بالکل شروع میں دین اسلام کے بارے میں لکھا ہے ''یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا((1 قرآن مجید ((2 سنت ص ۱۰ ص ۹

کوئی بھی منصف مزاج یہ فیصلہ کرنے میں تامل نہیں کریگا کہ بیک وقت تواتر عملی اور تواتر قولی کی شرط عائد کرنے سے تو قرآن کے ثبوت کو بھی مشکوک بنانا ہے کیونکہ قرآن اگرچہ قولی طور پر متواتر ہے لیکن اس کی بعض آیات و احکام پر عملی تواتر تو کجا سرے سے عمل نہیں ہو رہا چنانچہ اس میں بیان شدہ حدود عرصۂ دراز سے معطل ہیں جہاد و قضا کی آیات مدت مدید تک تعطل کا شکار رہیں جبکہ انقطاع سے تواتر ختم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا غامدی صاحب کی نیت واللہ اعلم کہ کیا ہے لیکن الفاظ کی بناوٹ یہ بتلا رہی ہے کہ اس سے قرآن و سنت کے انکار کا راستہ ہموار کیا جارہا ہے۔

علاوہ ازیں اگر اُن سنتوں پر نظر ڈالی جائے جن کو بالا جماع امت نے تسلیم کیا ہے اور جو غامدی صاحب کی تعریف کے دائرے میں نہیں آتیں تو ان کی تعداد ہزاروں یا کم از کم سینکڑوں تک ب آسانی پہنچ جائیگی۔

علاوہ ازیں امت کی اکثریت نے آنحضور علیہ السلام کے قول اور عمل دونوں کو سنت ہی کہا ہے چنانچہ وہ جب بھی قرآن و سنت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اس میں سنت کا اطلاق قول و فعل دونوں پر کرتے ہیں بلکہ اس نام کی متعدد مشہور کتب حدیث بھی آج تک متداول ہیں جیسے سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن دار قطنی، سنن دارمی اور سنن بیہقی وغیرہ ان میں قولی سنتوں کی تعداد بلاشبہ بہت زیادہ ہے، اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔

اگرچہ بعض حضرات نے سنت کا اطلاق صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل پر کیا ہے مگر اس میں کسی بھی امام سے شرط تواتر منقول نہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اگر سنت صرف عمل کا نام ہے اور اس کے لئے تواتر عملی سے ثبوت شرط ہے اور سنت سے مراد روایت ابراہیمی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ روایاتِ ابراہیمی کیلیئے یہ شرط کیوں نہیں لگائی گئی؟ کیا ابراہیم علیہ السلام کی روایات میں اذان تھی؟ یا نو مولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کی روایت اصل ملت ابراہیمی میں پائی جاتی تھیں یا حضور علیہ السلام کے دور تک اس پر تواتر سے تعامل جاری تھا، تواتر کیا بلکہ آپ کوئی ایک بھی روایت قابل اعتماد پیش کریں کہ جب مکہ اور مشرکین میں بچہ پیدا ہوتا تو وہ ملت حنیفہ کے

مطابق اس کے کان توحید کی صدا کی باز گشت سے بھرتے اور اسے فطرت کے مطابق توحید ربانی پر چلنے کی تلقین کرتے اسی طرح غسل جنابت، غسل حیض، غسل نفاس، غسل میت، عیدالفطر، مونچھیں پست کرنا، چھینک آنے پر الحمدللہ اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا، حیض و نفاس میں زن و شو کا تعلق سے اجتناب کرنا وغیرہ سب چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی روایات ہیں اور یہ ان سے تواتر عملی و قولی سے ثابت ہیں؟ **ھاتو ابرھانکم ان کنتم صادقین**

جناب غامدی صاحب ''اصول و مبادی'' میں لکھتے ہیں ''دین لاریب انہی دو صورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار احاد جنہیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا اس لئے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا'' دین سے متعلق جو چیزیں ان میں آتی ہیں وہ درحقیقت قرآن و سنت میں محصور اس دین کی تفہیم و تبیین اور اس پر عمل کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان ہیں۔''

المسترشد:۔ جناب غامدی صاحب نے یہاں پر بہت ہی ابہام و اجمال سے کام لیا ہے ایک اصطلاح خبر واحد کی ذکر کردی مگر اس کی وضاحت نہیں کی ہے اللہ جانے اس ابہام سے وہ کیا مراد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس سے نقد نقصان یہ ہوسکتا ہے کہ عوام کی نظر میں حدیث کی وقعت اور درجہ ختم ہوسکتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ اور اصلاح کی کچھ

وضاحت کردی جائے اور پھر صحیح صورتحال قارئین کے سامنے پیش کردی جائے وباالله التوفیق۔

حدیث کی اقسام

ویسے تو حدیث کی اقسام کافی ہیں تاہم اختصار کے پیش نظر یہاں تین قسمیں بیان کرنا مناسب ہے۔

(1) خبر متواتر:۔ اس حدیث کو کہا جاتا ہے کہ اس کو روایت کرنے والے راویوں کی تعداد ہر دور میں اتنی زیادہ رہی ہو کہ از روئے عقل ان کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو۔

(2)...... خبر مشہور: جس کو روایت کرنے والے ہر دور میں کم از کم تین ثقہ آدمی یعنی بااعتماد لوگ ہوں۔

(3) خبر واحد: جس کے راویوں کی تعداد تین سے کم ہو۔

ان میں سے پہلی قسم مفید یقین ہے دوسری قسم سے ظن غالب کا علم حاصل ہوتا جبکہ تیسری قسم سے ظن حاصل ہوتا ہے۔

چونکہ قسم اول سے یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے اس لئے بالاجماع اس سے عقیدہ بھی ثابت ہوتا ہے اور عمل بھی جبکہ باقی اقسام سے عمل کا اضافہ تو بالاجماع ہوتا ہے مگر عقیدے کا اضافہ جمہور کے نزدیک نہیں ہوتا گو کہ محقق ابن ھمام رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''المسایرہ'' میں ظنی سے بھی عقیدے کے اثبات کا موقف اپنایا ہے چنانچہ وہ علم کلام کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

''والكلام معرفة النفس ماعليها من العقائد المنسوبة الى دين الاسلام عن

الادلة علماً وظناً فی البعض منھا" یعنی ان عقائد کو جو اسلام کی طرف منسوب ہیں دلائل یقینیہ اور بعض میں ظنیہ سے پہچاننا علم کلام کہلاتا ہے۔
(المسایرہ ص ۱۰ طبع دائرۃ المعارف الاسلامیہ مکران)

خبر واحد سے دین میں اضافہ بالاجماع جائز ہے

جناب غامدی صاحب نے اس مندرجہ بالا عبارت میں جو موقف اپنایا ہے یہ امت کے آئمہ مجتہدین اور علماء معتبرین میں سے کسی کا قول نہیں اور نہ ہی اس بارے میں کوئی اختلاف منقول ہے چونکہ عقیدہ یقین ہی سے ثابت ہوتا ہے اس لئے اس کی دلیل قطعی اور یقینی ہونی چاہئے جو قرآنی آیت اور متواتر حدیث ہے جیسے عذاب قبر وغیرہ جبکہ عمل تو ظنی حدیث سے بھی ثابت ہو سکتا ہے اس لئے جہاں نص قطعی نہ ہو وہاں ظنی پر عمل ہوگا جو خبر واحد وغیرہ ہے حتیٰ کہ جمہور کے نزدیک تو قیاس واستحسان اور استصحاب الحال وغیرہ سے بھی عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا خبر واحد سے دین میں اضافۂ عمل میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی اس میں اختلاف کرنے اور شکوک ڈالنے کی گنجائش ہے۔

بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کی بنیاد اخبار آحاد پر ہے اگر ان کا اعتبار ختم کر دیا جائے تو دین کے مسائل کی تعداد چالیس تک بھی نہیں پہنچے گی جیسا کہ جناب غامدی صاحب نے کیا ہے۔

ہاں البتہ اگر خبر واحد قرآن کی آیت یا حدیث متواترہ کے خلاف ومعارض آجائے تو اس صورت میں خبر واحد پر عمل نہیں کیا جائے گا جیسا کہ اصول

البز دوی میں ہے۔

”فلذالک نقول انہ لایقبل خبر الواحد فی نسخ الکتاب ویقبل فیما لیس من کتاب اللہ علی وجہ لاینسخہ، ومن رَدَّ اخبار الآحاد فقد ابطل الحجۃ فوقع فی العمل بالشبہۃ وھو القیاس او استصحاب الحال الذی لیس بحجۃ اصلاً ومن عمل بالآحاد علی مخالفۃ الکتاب و نسخہ فقد ابطل الیقین و الاول فتح باب الجھل و الاِلحاد و الثانی فتح باب البدعۃ“

یعنی خبر واحد کتاب اللہ (قرآن) کو نسخ کرنے میں مؤثر نہیں ہو سکتی جبکہ باقی اعمال ومسائل میں قابل قبول ہے اس طور سے کہ قرآن کی تنسیخ لازم نہ آتی ہو، اور جس نے اخبار آحاد کو مسترد کر دیا تو اس نے (دراصل ایک) دلیل کو ختم کر دیا پس وہ شبہے کی بنیاد پر عمل کرنے میں مصروف عمل ہو گیا جو قیاس یا استصحاب الحال ہے جو (استصحاب) ہر گز دلیل نہیں اور جو شخص قرآن کے برخلاف اخبار آحاد پر عمل کرتا ہے اور قرآن کو نظر انداز کرتا ہے تو......وہ یقین کو باطل کرتا ہے (یعنی یقینی شے کو چھوڑ کر ظنی پر عمل پیرا ہو جاتا ہے) پہلی صورت میں (یعنی خبر واحد کو یکسر نظر انداز کرنے سے) جہالت اور الحاد کا دروازہ کھل جاتا ہے جبکہ دوسری صورت میں (یعنی ترک قرآن کرکے خبر واحد پر عمل کرنے سے) بدعت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔(اصول البزدوی مع شرحہ کشف الاسرار ص ۲۴ ج ۳ قدیمی کتب خانہ)

ہم جناب غامدی صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ خدارا جہل و الحاد کا دروازہ نہ کھولیں کہ اس کے نتائج نہ آپ کے حق میں اچھے ہوں گے اور نہ ہی امت کے حق میں، آئمہ نے جو اصول بیان کئے ہیں انہی پر اکتفا کیجئے۔

خبر واحد سے قرآن پر اضافہ

•جیسا کہ عرض کیا جاچکا کہ خبر واحد سے دین میں اضافہ بالاتفاق جائز ہے اور دین کے اکثر مسائل کا دارومدار اخبار آحاد پر ہے اور فی الجملہ غامدی صاحب نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۰ پر وہ لکھتے ہیں: ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے''

پھر جو مثالیں دی ہیں ان میں ایسی اشیاء بھی ہیں جو اُخبار آحاد سے ثابت ہیں لہذا انکو اپنی غلطی کا اقرار کر لینا چاہئے۔

تاہم خبر واحد سے قرآن پر اضافہ ہو سکتا ہے یا نہیں تو اس بارے میں آئمہ کرام کے درمیان اختلاف رہا ہے، اس مختصر کتاب میں اس پورے مضمون کا احاطہ تو نہیں ہو سکتا البتہ مختصر مطلب وخلاصہ پیش ہے۔

حنفیہ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر کسی طرح کا اضافہ نہیں ہو سکتا یہ صرف خبر متواتر ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک خبر مشہور سے بھی ہو سکتا ہے جیسے موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ ہے جبکہ شوافع، حنابلہ اور اکثر اہل علم کے نزدیک شرط اور قید و تخصیص کا اضافہ ہو سکتا ہے یہ اختلاف دراصل اس پر مبنی ہے کہ مطلق کو مقید کرنا اور عام کو خاص کرنا نسخ کے زمرہ میں شامل ہے یا نہیں ہمارے ہاں یہ بھی نسخ ہے لہذا اس کیلئے قوی دلیل کی ضرورت ہے جو خبر متواتر یا کم از کم مشہور ہے خبر واحد کا درجہ یقین سے کم ہے لہذا یہ قطعی کو

منسوخ نہیں کر سکتی، جبکہ جمہور کے نزدیک یہ نسخ نہیں لہذا یہ اضافہ جائز ہے، اس اختلاف پر متعدد مسائل بھی اختلافی بن گئے۔
مثلاً (ا)وضوء میں نیت شرط ہونا ((2وضو کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا ((3نماز میں فاتحہ خلف الامام پڑھنا ((4 رکوع و سجود میں تعدیل و طمانیہ ((5 رکوع و سجدہ میں تسبیحات پڑھنا ((6 طواف کیلئے طہارت کا شرط ہونا وغیرہ وغیرہ یہ سب ہمارے نزدیک لازمی نہیں کیونکہ ان صورتوں میں قرآن کی آیتیں جو مطلق ہیں اطلاق و عموم پر باقی نہیں رہیں گی جبکہ جمہور کے نزدیک یہ سب لازمی ہیں جیسا کہ فقہ اور اصول فقہ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اصول بزدوی میں ہے "**ولایزادعلی الکتاب بخبر الواحدعندناولایترک الظاہر من الکتاب ولاینسخ بخبر الواحد**"(ص۲۰ج۳قدیمی کتب خانہ)
یعنی ہمارے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر اضافہ نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے قرآن کا ظاہری مطلب ترک کیا جائیگا اور نہ ہی خبر واحد سے قرآن کو منسوخ مانا جائے گا۔ اس کی شرح میں امام عبدالعزیز بن احمد بخاری لکھتے ہیں "**وعندالشافعی وعامۃ الاصولیین یجوز تخصیص العموم بہ**" امام شافعی اور عام اصولیوں کے ہاں خبر واحد سے قرآن کے عموم کی تخصیص جائز ہے (کشف الاسرار ص۲۰ج۳قدیمی کتب خانہ)اس کا مطلب یہ ہوا کہ خبر واحد ردی کے ٹوکرے میں ڈالنے کی چیز نہیں بلکہ شرعی دلیل و حجت ہے خاص کر عمل کے حوالے سے ہاں اس میں راویوں کی وجہ سے ظنیت ضرور آئی ہے لیکن علماء نے اس کا بھرپور خیال رکھا ہے کہ جہاں خبر واحد کسی قطعی دلیل سے معارض و متضاد ہو جائے تو اس میں تاویل کی جائے یا راوی کے سہو پر محمول کیا جائے اور جہاں

کوئی تعارض نہ ہو تو وہاں بالاتفاق اسے قبول کیا جائے گا، اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خبر واحد پر بلا جھجک عمل کرتے اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں ازاں جملہ ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی پھر جب قبلہ کی تحویل ہو گئی تو ایک صحابی نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر وہ شخص دوسری مسجد سے گزر رہا تھا تو دیکھا کہ لوگ قبلہ اول کی جانب نماز پڑھ رہے ہیں وہ کہنے لگا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور یہ کہ آپؐ کو کعبہ کی جانب نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ لوگ عصر کی نماز میں دوران رکوع کعبے کی جانب مڑ گئے (بخاری شریف ص۱۰۷۷ ج۲)

دیکھئے یہ بلاشبہ خبر واحد تھی مگر سنتے ہی تمام نمازی صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا یہاں کوئی تواتر قولی یا عملی نہیں تھا، اس کے علاوہ امام بخاری نے صحیح بخاری کے اندر ''کتاب اخبار الآحاد'' کے عنوان سے مستقل بحث ذکر فرمائی ہے جس کو تفصیل چاہیئے وہ خود وہاں دیکھ لے۔

جناب غامدی صاحب تحریر فرماتے ہیں چنانچہ اس (قرآن) کے ترجمہ و تفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہیں۔ ان سے ہٹ کر اس کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جاسکتی'' (اصول و مبادی ص۲۰)

اور ''اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے (ص۲۶)

المسترشد: جناب غامدی صاحب کو ''سبعۃ احرف'' والی حدیث سے بہت چڑ

ہے اس لئے یہ عبارت گویا اس کی نفی کی تمہید ہے، ورنہ اس حصر کی بظاہر کوئی وجہ نہیں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”**لایکون احد فقیھا حتی یحمل الأیۃ الواحدۃ علی محامل متعددۃ**“ آدمی اس وقت تک ماہر قرآن نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ ایک آیت کو متعدد صورتوں پر محمول نہ کر سکتا ہو۔ کیونکہ قرآن کی عالمگیریت وجامعیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کو کسی ایک زمانے یا ایک معنی میں محصور نہ کیا جائے نیز بلاغت اور اعجاز، قرآن کی امتیازی شان ہے اور یہ چیز تب ہی اُجاگر ہو سکتی ہے جب رموز و اشارات کا بھرپور استعمال کلام میں کیا جائے جیسا کہ مطول وغیرہ بلاغت کی کتابوں میں ہے کہ معنی معروف و حقیقی کا استعمال تو ہر ایک کر سکتا ہے بلاغت کا پتہ مجازات و استعارات سے چل سکتا ہے، غامدی صاحب کا یہ اصول، قاعدۂ بلاغت کے خلاف ہے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کی حیثیت ایک عام کتاب کی مانند رہ جائے گی۔

علاوہ ازیں قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور عربی میں مشترک اور متضاد الفاظ اسی طرح الفاظِ مترادفہ بکثرت پائے جاتے ہیں ایسے میں معنی معروف و متعین کا پتہ چلانا درجۂ یقین میں ممکن نہیں مع ھذا غامدی صاحب کا یہ اصول ان کے دوسرے اصول سے معارض و مبائن بھی ہے جیسا کہ وہ ص ۳۷ پر ”الفاظ کی دلالت“ کے عنوان کے ضمن میں لکھتے ہیں ”دنیا کی ہر زندہ زبان کے الفاظ واسالیب جن مفاہیم پر دلالت کرتے ہیں وہ سب متواترات پر مبنی اور ہر لحاظ سے بالکل قطعی ہوتے ہیں“ چند سطور آگے لکھتے ہیں لفظ اور معنی کا سفر کبھی الگ الگ نہیں ہوتا، وہ جب تک مستعمل رہتا ہے اپنے معنی کے ساتھ مستعمل رہتا ہے“ اور ص ۲۶ کی

عبارت اوپر بیان ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کی دلالت اپنے معنی پر قطعی ہے جبکہ الفاظ مشترکہ، متضادہ اور مترادفہ کے استعمال میں گو عندا لمتکلم قطعیت ہوتی ہے اور معنی مراد متکلم کے نزدیک بالکل واضح ہوتے ہیں مگر اس پر دلالت ہر گز قطعی نہیں جبکہ یہاں بحث دلالت کی ہو رہی ہے کیونکہ قطعیات میں اختلاف نہیں ہوتا جبکہ قرآن کی بہت سی آیتوں کے معنی مراد متعین کرنے میں آئمہ کا اختلاف رہا ہے اور آج تک کوئی قطعی نتیجہ معلوم نہ ہو سکا ہے، مثلاً طلاق یافتہ عورت اپنی عدت کیسے گزارے گی؟ تین حیض یا تین طہر سے؟ اس کا کوئی قطعی حل کسی کے پاس نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک میں اس کے لئے ''ثلاثة قروءٍ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ''قرء'' کا اطلاق عربی میں جس طرح حیض پر ہوتا ہے اسی طرح طہر پر بھی ہوتا ہے، پس حنفیہ نے تدبر کر کے اس سے حیض لیا اور شافعیہ نے تدبر کر کے طہر کے معنی لئے اب اگر ہم ان کو الزام دیں کہ آپ نے صحیح تدبر نہیں کیا اس لئے آپ کا مطلب غلط ہے تو وہ بھی ہمیں یہ جواب دے سکتے ہیں اگر ہم کسی قانون کا سہارا لیں تو وہ بھی لے سکتے ہیں۔

اس لئے مشہور محقق علامہ عبدالرحمن ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

بلکہ اختلاف کا رونما ہونا یقینی ہے کیونکہ اکثر دلائل قرآن پاک کی آیتیں ہیں اور قرآن عربی میں ہے، عربی زبان کے الفاظ متعدد معنی کا احتمال رکھتے ہیں، اس لئے قرائن سے کسی معنی کی تعیین کرنی پڑتی ہے لہذا بغیر اختلاف کے چارہ نہیں

(مقدمہ ابن خلدون مترجم ص ۱۴۱ ۳ ج ص ۱۴۱ ۳ ج ۲)

دیکھئے علامہ صاف کہتے ہیں کہ عربی زبان کے الفاظ متعدد معنی کا احتمال رکھتے ہیں اس لئے اختلاف کا رونما ہونا یقینی ہے مگر جناب غامدی صاحب اس

بدیہی حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور معنی واحد کے علاوہ باقی سب کو غلط قرار دیتے ہیں۔

مزید برایں کبھی معنی معروف پر لفظ کو محمول کرنے سے مطلب یکسر غلط یا بدل جاتا ہے مثلاً سورہ کہف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے۔ ”حتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَھَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَھَا قَوْمًا“ الایہ“

اب اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ذوالقرنین وہاں تک چلے گئے جہاں سورج سیاہ چشمے، یا دلدلی زمین میں ڈوبتا تھا تو بلاشبہ یہ صحیح بات نہ ہو گی اس لئے ''عین حَمِئَۃٍ'' کے معروف معنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح بخاری میں ہے ”ذوقوا“ باشروا و جرّبوا و لیس ھذا من ذوق الفم

(بخاری ص ۴۶۱ ج ا باب صفۃ النار)

یعنی ''ذوقوا'' کے معروف اور لغوی معنی بلاشبہ منہ سے چکھنے کے ہیں لیکن یہاں وہ معروف معنی مراد نہیں کیونکہ دوزخ کی آگ منہ سے چکھنے کی چیز نہیں اور نہ ہی کوئی عاقل اس کا قائل ہو سکتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جہنم میں پڑے رہو، اس کو آزماؤ اور تجربہ کر لو۔

اسی طرح بخاری جلد اول ص ۱۰ پر ہے عن عبداللہ: لما نزلت، الذین أمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم“ قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اینا لم یظلم؟ فانزل اللہ عزو جل ”ان الشرک لظلم عظیم“

یعنی جب یہ آیت نازل ہوئی: جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے تو صحابہ کرام ؓ نے فرمایا کہ ہم میں سے ایسا کون ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: بے شک شرک بہت بڑا

ظلم ہے، یعنی اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔
دیکھئے صحابہ کرام نے ظلم کا ایک معنی لیا جبکہ یہاں ایک غیر معروف معنی مراد تھا اب اگر غامدی صاحب یہ کہیں کہ صحابہ نے تدبر نہیں کیا تھا تو یہ ان کی جسارت ہو گی جو وہ ہی کر سکتے ہیں۔
شرح عقائد میں ہے: **والنصوص من الکتاب والسنۃ تحمل علی ظواھرھا مالم یصرف عنھا دلیل قطعی کما فی الایات التی تشعر بظواھرھا بالجھۃ والجسمیۃ ونحو ذالک"**
(ص ۱۱۹ طبع مکتبہ علوم اسلامیہ پشاور)
قرآن و حدیث کی نصوص کو ظاہر پر حمل کیا جائے گا جب تک اس سے پھیرنے کیلئے کوئی قطعی دلیل نہیں آتی جیسے وہ آیتیں جو بظاہر جہت اور جسمیت پر دلالت کرتی ہیں یا اس قسم کی اور نصوص۔ اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو ہر آیت کو ظاہر اور معروف پر محمول کیا جائے گا اور نہ ہی بلاوجہ تاویل کی گنجائش ہے بلکہ اصل اصول یہ ہے کہ ظاہری مطلب لیا جائے گا ہاں اگر تاویل از روے عقل یا نقل ناگزیر ہو تو اس سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ اور شاید اسی حکمت سے اللہ نے نبوت عربوں میں منتقل فرما دی تاکہ زبان کی وسعت کا فائدہ قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کو پہنچے، لہذا مطلب کو ایک ہی معنی تک محدود کرنا حکمت کے منافی ہے جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں۔
"اول یہ کہ اس کو سمجھنے کیلئے اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے...... پھر ایک سطر آگے لکھتے ہیں...... اس کے لئے قرآن سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی یہ سب چیزیں خود قرآن ہی کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتی

ہیں۔آدمی جب قرآن پر تدبر کرتا ہے،اس کے لفظ پر ڈیرا ڈالتا ہے......ان کے لئے پھر کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی"(ص ۲۲) وہ ص ۲۶ پر لکھتے ہیں:

"قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے،اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا"

المستر شد یہ عبارت انکار حدیث کی راہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار کی حامل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر کا کام صرف اور صرف قرآن پہنچانا ہے وبس نہ اسے تحدید و تخصیص کی اجازت ہے اور نہ ہی وہ تدبر قرآن میں امت کی ضرورت ہے والعیاذ باللہ

پیغمبرؐ بالاجماع تخصیص کے مجاز ہیں

جناب غامدی صاحب اور ان کے استاذ صاحب امین احسن اصلاحی صاحب کی یہ سوچ امت مرحومہ کی اجتماعی فکر کے منافی اور الحاد ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی ارشاد سنتے تو بلا جھجک اور بغیر کسی توقف کے اس پر یقین کرتے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرتے کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ کسی مخلص صحابی نے یہ کہا ہو کہ یہ حکم تو قرآن سے متصادم ہے یا قرآن کا مطلب و حکم یہ ہے اور آپ ہمیں دوسرا حکم ارشاد فرما رہے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ فتح مکہ کے

دن گستاخ رسول ابن خطل غلاف کعبہ سے لپٹا ہوا تھا مگر پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا دیکھئے بخاری ص۲۴۹ ج ا باب دخول الحرم ومکۃ بغیر احرام) چنانچہ صحابہ کرام ؓ نے اس حکم کی تعمیل کی اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ قرآن میں تو ہے ''ومن دخلہ کان اٰمناً'' اور جو اس میں آیا اس کو امن ملا، پھر آپ کیوں ابن خطل کے قتل کے حکم سے آیت کی تخصیص فرما رہے ہیں؟

جناب غامدی صاحب چونکہ ایک ہی قرآت کے قائل ہیں اس لئے ان کے نزدیک یقیناً پاؤں کا وظیفہ دھونا ہی ہونا چاہئے پھر سوال یہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کے جواز پر صحابہ کرام اور آئمہ فقہ والحدیث کا اجماع کس بنا پر منعقد ہوا؟

پیچھے عرض کیا جاچکا کہ جمہور آئمہ کے نزدیک تو خبر واحد سے بھی قرآن کی تحدید و تخصیص جائز ہے جبکہ حنفیہ کے نزدیک تحدید و تخصیص خبر واحد سے تو نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ظنی ہے البتہ خبر متواتر یا کم از کم مشہور سے ہو سکتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیغمبر خدا بالاتفاق تحدید و تخصیص کر سکتے ہیں البتہ مابعد کے راویوں کی وجہ سے خبر واحد شبہ کی بنا پر درجہ یقین سے کمتر ہونے کی وجہ سے تحدید و تخصیص کی قوت نہیں رکھتی، لیکن یہ فرق تو راویوں کی وجہ سے ہے نہ کہ پیغمبر خدا کے درجہ کے نقصان کی وجہ سے اور یہی وجہ ہے کہ اگر راویوں کے سہو و نسیان کا احتمال ختم ہو جائے جیسے حضور علیہ السلام کے زمانے میں یا بعد کی متواتر روایات میں تو پھر حنفیہ کے نزدیک بھی تحدید و تخصیص اور نسخ جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: **وانزلنا الیک الذکر لتبین**

للناس مانزل الیهم ''سورۃ النحل آیت ۴۴
اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت (قرآن) کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے''
''اصول سرخسی'' میں ہے کہ یہ آیت حدیث سے قرآن کی تنسیخ کی دلیل ہے کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''مانزل الیھم'' جو لوگوں کی طرف نازل ہوا یہ نہیں کہا گیا کہ ''مانزل الیک'' جو تیری جانب اترا ہے معلوم ہوا کہ مراد وہ حکم ہے جو قرآن کے علاوہ ہو ورنہ ''مانزل الیک'' ہی کہا جاتا: **فان المراد بیان حکم غیر متلو فی الکتاب مکان حکم آخر، وھو متلو علی وجه یتبین به مدة بقاء الحکم الاول و ثبوت حکم الثانی و النسخ لیس الاھذا** (ص ۲۷ج ۲)
غرض احادیث سے قرآن کی تحدید و تخصیص کی بہت سی مثالیں ہیں اور طے ہے کہ ایسے مواقع پر صحابہ کرامؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات ہی پر عمل کرتے یہ کہیں ثابت نہیں کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ تم خود اس پر تدبر کرو جو سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو چنانچہ ''**فاعتزلوا النساء فی المحیض**'' **الایه**
یعنی حالت حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، اس جدائی کا مطلب و معنی کیا ہے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہود کی طرح مکمل بائیکاٹ ہو کہ نہ عورت کے ساتھ مباشرت جائز ہو اور نہ رہن سہن وغیرہ اس کو باورچی خانہ اور کمرہ سے بھی دور رکھا جائے لیکن مسلم شریف کی حدیث کے مطابق ''**اصنعوا کل شئی اِلاّ النکاح**'' مجامعت کے سوا سب ازدواجی معاملات جائز ہیں اور یقیناً اسی پر صحابہ نے

بھی عمل کیا اور آج تک امت کا بھی یہی عقیدہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اب اگر جناب غامدی صاحب یہ موقف اختیار کریں کہ اس کے لئے حدیث کی کیا ضرورت ہے یہ کام تو تدبر سے بھی چل سکتا ہے تو یہ موقف انتہائی کمزور بلکہ غلط ہے کیونکہ اگر تدبر سے مراد جناب غامدی صاحب ہی کا تدبر ہو تو پھر مطلب یہ ہوا کہ آج تک امت قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہی اور اگر ہر صحیح تدبر کو بھی اس کی اجازت ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام ومفسرین کی تفاسیر رد کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ کام تو وہ کر چکے ہیں بلکہ وہ اس ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں تو کیا واقعہ کا مشاہدہ کرنے والے کی بات ماننا زیادہ قرین قیاس اور قابل بھروسہ نہیں بنسبت اس شخص کے جو تقریباً پندرہ سو سال بعد تجزیہ کرتا ہے۔

اگر جناب غامدی صاحب یہ تاویل کریں کہ یہ باتیں فطرت کی مدد سے معلوم ہو سکتی ہیں جیسا کہ وہ صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں: کہ حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے، اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی...... پھر چند سطور آگے لکھتے ہیں: انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے اور صفحہ نمبر ۳۴۳ پر لکھتے ہیں: لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا۔

المسترشد عرض کرتا ہے کہ فطرتوں کا سروے کرنے کے بجائے کہ کس قوم کی فطرت صحیح ہے اور کس کی غلط چائنا کے لوگ بلا استثنا تمام جانور

کھاتے ہیں خواہ بلیاں اور کتے ہوں یا دوسرے جانور جبکہ ہندوستان کے لوگ بہت سے جانوروں سے پرہیز کرتے ہیں پھر فیصلہ کرنے والے پر متفق ہونا بھی ناممکن ہے کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فطرت پر اعتماد کیا جائے کہ انہوں نے فطرت سلیمہ کے مطابق جو کچھ بیان کیا اور تدبر و اجتہاد سے جو نتائج اخذ کئے اور اب تک امت نے اسی تحقیق پر بھروسہ اور عمل کیا تو اگر ہم بھی اس کو کافی سمجھیں اور حضور علیہ السلام کے بیان کردہ مطالب و شرائع کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیں تو اس میں کیا قباحت ہے جبکہ ہر کس و ناکس کو تدبر و فطرت کے مطابق عمل کرنے کا لائسنس جاری کرنے میں بے شمار قباحتیں ہیں کہ یہ لائسنس غیر مدبر اور بگڑی ہوئی مسخ شدہ فطرت کے مالک کو بھی مل سکتا ہے۔ اللہ جانے جناب غامدی صاحب ایسے خطرناک اصول بنا کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو لوگ صحیح نماز نہیں پڑھ سکتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ داڑھی مرد کی فطرت ہے یا شامت ان کو تدبر اور فطرت بنیاد بنانے کا درس دینا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''سوم یہ کہ اس کے عام و خاص میں امتیاز کیا جائے۔ قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر الفاظ عام ہیں لیکن سیاق و سباق کی دلالت پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ ان سے مراد عام نہیں ہے قرآن 'الناس' کہتا ہے لیکن ساری دنیا کا تو کیا ذکر، بارہا اس سے عرب کے سب لوگ بھی اس کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ (اصول و مبادی ص ۲۴)

المسترشد: ٹھیک ہے کہ مرادِ متکلم کبھی کبھی، مراد کلام سے خاص ہوتی

ہے اور اس کے بر عکس کبھی کبھار مراد متکلم، مراد کلام سے عام ہوا کرتی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: **ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قال :اذا کان احد کم فی المسجد فو جد ریحاً بین الیتیہ فلایخرج حتی یسمع صوتاًاو یجد ریحاً"**

(ترمذی ص ۲۳ ج ا باب ماجاء فی الوضوء من الریح)

اگر تم میں سے کوئی ایک مسجد میں ہو اور وہ اپنی دونوں چکتیوں کے درمیان ہوا محسوس کرے (کہ خارج ہوئی) تو جب تک آواز نہ سنے یا بدبو محسوس نہ کرے اس وقت تک مسجد سے نہ نکلے،

دیکھئے اس میں مراد لفظ بہت محدود ہے لیکن مراد متکلم عام ہے یعنی یقین حاصل کرنا خواہ وہ کسی بھی ذریعہ سے ہو،

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے **عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الطفل لا یصلیٰ علیہ ولا یرث ولا یورث حتی یستھل"**

(ترمذی ص ۲۰۰ ج ا باب ماجاء فی ترک الصلوٰۃ علی الطفل حتیٰ یستھل)

نومولود بچہ جب تک نہ روئے نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، نہ وہ میراث لے سکتا ہے اور نہ اس سے میراث کا استحقاق ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بھی مراد متکلم عام ہے اور حکم صرف رونے پر عائد نہیں بلکہ مراد حیات ہے خواہ اس کے آثار رونے کے سوا کسی بھی ذریعہ سے معلوم ہوں۔

لیکن عام ضابطہ یہ ہے کہ **"العبرۃ لعموم الالفاظ دون خصوص المورد"** اعتبار الفاظ کے عام ہونے کا ہے نہ کہ شان نزول کا، چونکہ حضور علیہ السلام مقنن اور قانون ساز تھے اور قانون کا حکم عام ہوتا ہے جہاں تخصیص کی کوئی

دلیل نہ ہو تو قانون اپنے زیر اثر پورے دائرے کو شامل ہوتا ہے اس لئے شریعت کا ہر حکم خواہ وہ آیت سے معلوم ہو یا حدیث سے عام ہی رہے گا، جیسے کسی ملک کا آئین بلا استثناسب کیلئے یکساں ہوتا ہے الّا یہ کہ اس سے صدر مملکت وغیرہ کو کسی صریح شق میں مستثنٰی کر دیا گیا ہو، اسی طرح شریعت کے احکام بھی بلاامتیاز تمام مسلمانوں کو شامل رہتے ہیں۔

بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاق و سباق اور الفاظ کی ظاہری دلالت تخصیص کو مقتضی ہوتی ہے مگر وہاں عموم ہی ہوتا ہے چنانچہ ''وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتباً فرھان مقبوضة''

(سورہ بقرہ آیت ۲۸۴)

''اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو'' اس آیت میں گروی رکھنے کو بظاہر دو شرطوں سے مشروط کیا گیا ہے کہ تم سفر پر ہو اور دستاویز لکھنے والا کوئی نہ ملے لیکن مع ھٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں بحالت حضر ایک یہودی کے پاس اپنی ذرہ تیس صاع جو کے بدلے گروی کے طور پر رکھوالی تھی امام بخاری نے اس کیلئے اپنی جامع میں دو باب باندھے ہیں دیکھئے بخاری جلد اول ص ۳۴۱ اول کتاب الرھن)

اسی طرح یہ آیت ''خذ من اموالھم صدقة'' لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ (سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۰۳) بظاہر صدقات کی وصولی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص کر دیتی ہے کہ خطاب بھی آپؐ ہی سے ہے اور سیاق و سباق کی دلالت بھی کچھ اس طرف مشیر ہے مگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد ان لوگوں سے زبردستی زکوٰۃ وصول فرمالی جو خلیفہ

وقت کی حکومت کو زکوٰۃ دینے سے منکر تھے حتیٰ کہ نوبت لڑائی تک پہنچی۔

اسماء اجناس کی دلالت اپنے معانی پر ایسی ہی ہے جیسے ''کلی'' کی دلالت اپنے افراد پر، تمام منطقیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ کلی کا اطلاق اور صدق اپنے تمام افراد پر ہوتا ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد کلی کے دائرے سے خارج ہو جائے، چونکہ لفظ کا مدلول اپنے معانی میں مشترک ہوتا ہے اس لئے تمام افرادِ معنیٰ ایک کلی کے افراد تصور ہوتے ہیں لھذا اطلاق تو سب کو شامل ہو گا البتہ شریعت کسی فرد کو حکم سے مستثنیٰ قرار دے تو یہ اس کا حق ہے پس ایسے فرد پر لفظ کے اطلاق کے باوجود حکم لاگو نہ ہو گا۔

یہ ارادہ ٹھیک نہیں

جناب غامدی صاحب نے یہ اصول چہرے کے پردے اور عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے نصف کی نفی کی راہ ہموار کرنے کے لئے اپنایا ہے، چنانچہ اس خود ساختہ اصول کے تناظر میں وہ یہ بات اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں کہ چہرے کا پردہ صرف امہات المؤمنین کے لئے تھا یا پھر زیادہ سے زیادہ صحابیات کے دور تک محدود تھا جب معاشرے میں منافقین چھپے ہوئے تھے آج وہ علت نہیں، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا، اس موضوع پر انشاء اللہ مستقل کام کرنے کا ارادہ ہے۔

اسی طرح عورت کی گواہی کا مسئلہ ان کی نظر میں اُس طرح نہیں جیسے امت کے آئمہ اور فقہا سمجھے ہیں بلکہ مرد اور عورت دونوں کی گواہیوں کی حیثیت برابر ہے اور جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے ''فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشھداء'' الایة (بقرہ آیت ۲۸۲)

توبقول جناب غامدی یہ صرف مدائنہ کے بارے میں ہے عام نہیں، رہی بخاری کی یہ حدیث کہ : اَلَیْسَ شهادة المرأة مثل نصف شهادة الرجل؟ قلن بلیٰ" (ص ۳۶۳ ج ۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا عورت کی گواہی مرد کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں؟ عورتوں نے کہا کیوں نہیں" توغامدی کواس سے صرف نظر کرنا کوئی مشکل نہیں لگ رہی ہے۔

غرض اصول یہ ہے کہ حکم اور مطلب میں بنیادی کردار لفظ کا ہے اگر وہ بظاہر عام ہے تواسے عموم ہی پر رکھا جائے گا، گو بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دلیل کی بنا پر لفظ عموم کے افادے سے قاصر رہے، جو ایک شاذ و قلیل اور استثنائی صورت ہے مگر اسی شاذ صورت کو بنیاد بنا کر شہادت اور پردے وغیرہ سے متعلقہ آیات کو بھی خاص کہنا سوء فہم پر مبنی ہے، یہ عام ہی ہیں کوئی دلیل انکی تخصیص کی نہیں بلاشبہ یہ غلطی بدیہی ہے عرف عام میں بھی محاورات والفاظ دالہ کا مطلب سب لوگ عام سمجھتے ہیں اور عرف واجماع بذات خود قوی دلیل ہے، اگر حکومت کی جانب سے یہ اعلان کردیا جائے کہ پیٹرول کی قیمت میں فی لیٹر پانچ روپیہ اضافہ کردیا گیاہے تو کیااس سے مراد دو چار پیٹرول پمپ ہوتے ہیں یاان تمام پمپوں پراس کااطلاق ہوتاہے جہاں تک حکومت کادائرہ اختیار ہوتاہے اسی پر باقی الفاظ کو قیاس کیا جائے۔ لھذا ایک شاذ صورت سے عام کا راستہ روکنا نیک نیتی نہیں بلکہ افسوس ہے کہ بدنیتی پر مبنی ہے۔

یہ روش درست نہیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ عندی تحقیق کا ذوق رکھنے والے وہ

لوگ جو شہرت اور حب جاہ کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اکثر و بیشتر وہ اپنا کوئی مدعا پیش کر لیتے ہیں پھر نصوص کے مطالب کو توڑ مروڑ کر اس پر فٹ کر دیتے ہیں اگر یہ کام بہ آسانی ہو سکے تو فبہا ورنہ ان نصوص کا انکار کر دیتے ہیں۔

جناب غامدی صاحب نے ''اصول و مبادی'' میں ایسا ہی طرز اپنایا ہے یہ وہی روش ہے جو اس دبستان کے اکثر شرکاء کا کارنامہ ہے جس پر جناب غامدی صاحب کو ناز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے آپس میں بہت سی باتوں پر شدید اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، ان کے پیشوا جناب علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے جہاد و سیرت اور معجزات وغیرہ میں مخصوص نظریہ پیش کیا اور سیرت پر کتاب ''سیرۃ النبی'' کا ایک ضخیم حصہ لکھدیا لیکن محققین علماء کو وہ حصہ پسند نہیں آیا چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی ہے اور آپؐ کو جامع اوصاف کمالات قرار دے کر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا۔ آپ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے لکھتے ہیں ''کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترحم تھا، باقی اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترحم نہ تھا، کسی میں یہ صفت نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی...... ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں۔''

(وعظ الحیواۃ رجب ۷ ۱۳۴۳ ص ۵۸۴)

اور وعظ ''مطاہر الاموال'' جس کو مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے مرتب کیا ہے میں فرماتے ہیں: چنانچہ ایک شمس العلماء نے آج کل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح عمری لکھی ہے جس پر اُن کی جماعت کو فخر و ناز ہے اور نو تعلیم یافتہ مسلمان محض اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک خطاب یافتہ ''شمس العلماء'' ہے اس کو بہت شوق سے دیکھتے اور منگواتے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ یہ خطاب ایک جال ہے جس میں ناواقفوں کو پھنسایا جارہا ہے (ص ۶۳۲ مکتبہ اشرف المعارف ملتان) واضح رہے کہ اس سیرت کا جو حصہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے تحریر کیا ہے وہ علماء کی نظر میں بڑی وقعت کا حامل ہے۔

اس دبستان کی ایک قابل فخر ہستی ابوالاعلی مودودی صاحب ہیں جن کے بارے میں مولانا سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں: مولانا ابوالاعلی مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی کے نام سے ایک سیاسی اور دینی جماعت اخوان المسلمین کی طرح ابھری، یہ بھی اس کی قائل ہے کہ اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داری قانون شریعت کا نفاذ ہے جو قرآن و سنت پر مبنی ہو، مگر اس کے بھی بعض عقائد زیر بحث رہتے ہیں (مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب ص ۲۸)

جناب مودودی صاحب نے دوسرے نظریات کے ساتھ یہ بھی دعوی پیش کردیا کہ قرآنی تعلیمات کے اصل اہداف جہاد اور اسلامی حکومت کا قیام ہے یہ نماز، روزہ اور حج وزکوۃ وغیرہ اس جہاد اور خلافت کی مشق اور ٹریننگ کا حصہ ہیں چنانچہ وہ خطبات میں کہتے ہیں ''یہ نماز، روزہ اور یہ حج اور زکوۃ جنہیں اللہ تعالٰی نے آپ پر فرض کیا ہے اور اسلام کا رکن قرار دیا ہے یہ ساری چیزیں دوسرے مذہبوں کی عبادات کی طرح پوجا پاٹ اور نذر نیاز اور جاترا کی رسمیں

نہیں ہیں کہ بس آپ ان کو ادا کریں اور اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہو جائیں گے بلکہ دراصل یہ ایک بڑے مقصد کیلئے آپ کو تیار کرنے اور ایک بڑے کام کیلئے آپ کی تربیت کرنے کے خاطر فرض کی گئی ہیں‘‘

وہ آگے کہتے ہیں کہ:

’’مختصر الفاظ میں تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ مقصد انسان پر سے انسان کی حکومت مٹا کر خدائے واحد کی حکومت قائم کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے اور جان توڑ کوشش کرنے کا نام جہاد ہے، اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کے سب اسی کام کی تیاری کیلئے ہیں (خطبات ص ۲۲۷ بحوالہ مودودی صاحب کی حیاۃ وافکار) گویا یہ عبادات بذات خود مقاصد اصلیہ میں شامل نہیں ہیں۔

پھر جب حالات نامساعد ہو گئے تو جناب غامدی صاحب آ گئے اور اپنے پیش رو کے موقف سے یکسر انحراف کر کے وہ جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں ’’اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی اقوام پر نازل کیا گیا۔ لہذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرینِ حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے، قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے، مسلمانوں کے لئے قتال کی ایک ہی صورت باقی

رہ گئی ہے، اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ ہے، اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لئے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جاسکتی۔

(قانون جہاد ص ۴۰ طبع دوم نومبر ۲۰۰۶)

گویا دبستان شبلی کے شروع سے حال تک جہاد وغیرہ ان سب امور جو اہل مغرب کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں کے بارے میں یہ نشیب وفراز یورپ کے موڈ اور حالات کے رخ کے تابع رہتا ہے جب قیام پاکستان کی تحریک گرم تھی تو سارے احکام شرع کو مشق وتربیت قرار دے کر جہاد کو اصلی مقصد قرار دیا گیا اور جب حالات ناموافق ہوگئے تو قیامت تک کے لئے اس پر جناب غامدی صاحب نے پابندی عائد کردی، مذہبی فکر کو سیاسی چال کے تابع بنانے کی یہ روش اچھی نہیں اسلام ایک ضابطۂ حیات کا نام ہے، سیاسی چال یا ابن الوقتی کا نام نہیں ہے۔

تقلید کے بغیر چارہ نہیں

اگران لوگوں کی نیت خالصتاً اللہ کی خوشنودی کے حصول کی ہے تو چونکہ نئی راہیں تلاش کرنے میں گمراہی کا قوی اندیشہ ہوتا ہے اس لئے ان کو ان تحقیقات کے بجائے ان آئمہ پر اعتماد کرنا چاہئے جن پر امت کے محققین نے بھروسہ کرکے ان کی تقلید کی ہے، اپنی تحقیقات کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کبھی ایک موقف اختیار کیا اور کبھی دوسرا ایک ایڈیشن میں ایک بات لکھدی اور دوسرے میں کچھ اور لکھدیا، اس طرح اپنے پیروکاروں کو بھی مخمصے میں ڈالا

اور خود بھی تردد کی دلدل میں زندگی بسر کی۔

اسی بنا پر مشہور محقق علامہ عبدالرحمن ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اسلامی ممالک میں لوگوں نے ان ہی چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کی، اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام و نشان بھی نہ رہا لوگوں نے اختلافاتِ مسالک کا دروازہ بند کردیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہو گئی اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی اور اس لئے بھی کہ ہر کس و ناکس مجتھد نہ بن بیٹھے اس لئے صراحت سے کہہ دیا گیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کے لئے مجبور ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون مترجم ص ۴۴۳ ج ۲ نفیس اکیڈیمی)

جناب غامدی صاحب قرأتِ متواترہ میں سے صرف ایک قرأت کے قائل ہیں جو مصحف میں ثبت ہے اور جو ہر جگہ زبان زد عام ہے اس کے علاوہ باقی قرأتوں کے جواز یا ثبوت کے قطعاً قائل نہیں ہیں جیسا کہ وہ ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

''قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے یہ تلاوت جس قرأت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قرأت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے

(اصول و مبادی ص ۲۹)

وہ اپنے مدعی پر بطور استدلال یہ دو آیتیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) ''سَنُقرِ ئُکَ فَلاَتَنسیٰ اِلاَّ مَاشَاءَاللّٰہُ اِنہ یَعلَمُ الجَھرَ وَ مَا یَخفٰی''

(سورۃ الاعلی)

''ہم تجھے پڑھائیں گے پھر تو نہ بھولے گا، مگر جو کچھ اللہ چاہے وہ ظاہر اور پوشیدہ کو جانتا ہے''

(۲) ''لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرأنہ فاتبع قرأنہ ثم ان علینا بیانہ'' (القیامہ)

آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں پھر اس کا واضح کردینا ہمارے ذمہ ہے۔ (طریقۂ استدلال یہ ہے کہ) ''اولاً'' نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا کہ حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کرکے یہ قرآن جس طرح آپ کو دیا جارہا ہے اس کے دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے لیکن اس سے آپ کو اس کی حفاظت اور جمع و ترتیب کے بارے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے اس کی جو قرأت اس کے زمانۂ نزول میں اس وقت کی جارہی ہے اس کے بعد اس کی ایک دوسری قرأت ہوگی...... اور اپنی آخری صورت میں یہ بالکل محفوظ آپ کے حوالے کردیا جائے گا (ص ۳۰)

''ثانیاً'' آپؐ کو بتایا گیا ہے کہ یہ دوسری قرأت قرآن کو جمع کرکے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کردینے کے بعد کی جائے گی (ص ۳۰)

''ثالثاً'' یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے کسی حکم سے متعلق اگر شرح و وضاحت کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی اس موقع پر کردی جائے گی اور اس طرح

یہ کتاب خود اس کے نازل کرنے والے ہی کی طرف سے جمع و ترتیب اور تفہیم و تبیین کے بعد ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے گی۔

قرآن کی یہی آخری قرأت ہے جسے اصطلاح میں ''عرضہ اخیرہ'' کی قرأت کہا جاتا ہے (ص ۳۰)

یہاں ہو سکتا ہے کہ ''سبعۃ احرف'' کی روایت بعض لوگوں کے لئے الجھن کا باعث بنے (ص ۳۲)

اس روایت کے بارے میں ذیل کے چند حقائق اگر پیش نظر رہیں تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل ہی بے معنی روایت ہے۔

(۱) اول یہ کہ یہ روایت اگرچہ حدیث کی امہات کتب میں بیان ہوئی ہے لیکن اس کا مفہوم ایک ایسا معما ہے جسے کوئی شخص اس امت کی پوری تاریخ میں کبھی حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

(۲) دوم یہ کہ اس کی واحد معقول توجیہ اگر کوئی ہو سکتی تھی تو وہ یہی ہو سکتی تھی کہ ''سبعۃ احرف'' کو اس میں عربوں کے مختلف لغات اور لہجوں پر محمول کیا جائے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ روایت کا متن ہی اس کی تردید کر دیتا ہے۔

(۳) سوم یہ کہ اختلاف اگر الگ الگ قبیلوں کے افراد میں بھی ہوتا تو ''انزل'' (نازل کیا گیا) کا لفظ اس روایت میں ناقابل توجیہ ہی تھا اس لئے کہ قرآن نے اپنے متعلق یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ وہ قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ ہشام کے بارے میں معلوم ہے کہ فتح مکہ کے دن ایمان

لائے تھے، لہذا اس روایت کو مانئے تو یہ بات بھی ماننا پڑتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ سیدنا عمر جیسے شب و روز کے ساتھی بھی اس بات کا علم نہیں رکھتے تھے...... ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کیسی سنگین بات ہے اور اس کی زد کہاں کہاں پڑ سکتی ہے؟

یہی معاملہ ان روایتوں کا بھی ہے جو سیدنا صدیق اور ان کے بعد سیدنا عثمان کے دور میں قرآن کی جمع و تدوین سے متعلق حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں (یعنی وہ سب بے معنی و بے بنیاد ہیں)

قرآن اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حین حیات مرتب ہوا ہے۔

لیکن یہ روایتیں اس کے برخلاف ایک دوسری ہی داستان سناتی ہیں جسے نہ قرآن قبول کرتا ہے اور نہ عقل عام ہی کسی طرح ماننے کے لئے تیار ہو سکتی ہے۔

(۵) صحاح میں یہ (روایات) اصلاً ابن شہاب زہری کی وساطت سے آئی ہیں، آئمہ رجال انہیں تدلیس اور ادراج کا مرتکب تو قرار دیتے ہی ہیں اس کے ساتھ اگر ان کے وہ خصائص بھی پیش نظر رہیں جو امام لیث بن سعد نے امام مالک کے نام اپنے ایک خط میں بیان فرمائے ہیں تو ان کی کوئی روایت بھی، بالخصوص اس طرح کے اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی (ص ۳۵)

لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قرأت ہے جو ہمارے مصاحف میں ثبت ہے، اس کے علاوہ اس کی جو قرأتیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں یا مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں وہ سب اسی فتنۂ عجم کے باقیات ہیں جس کے اثرات سے ہمارے

علوم کا کوئی شعبہ افسوس ہے کہ محفوظ نہیں رہ سکا (اصول و مبادی ص ۳۶)
المسترشد: جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ان لوگوں (دبستان شبلی) کا کام یہ ہے کہ اپنا مخصوص نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور پھر آیات واحادیث کو توڑ مروڑ کر اس پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر باآسانی فٹ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو فبہا ورنہ ان کا انکار کر دیتے ہیں جناب غامدی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی موروثی عادت کا جوہر دکھایا ہے انہوں نے اپنے دعویٰ پر دو آیتیں پیش کر دیں انکی تفسیر و تاویل اپنی مرضی کے مطابق بناڈالی اور متواتر حدیث ''سبعۃ احرف'' کا انکار کر دیا بلکہ ان ناقابل تردید روایات کا بھی بلا تکلف انکار کیا جو سیدنا ابو بکر و سیدنا عثمان رضی اللہ عنھما کی جمع و تالیفِ قرآن سے متعلق ہیں سوال یہ ہے کہ ان آیات میں وہ کونسا لفظ ہے جس سے غامدی کا مطلب نکل رہا ہو؟ ان میں قرأت ثانیہ (دوسری) کا تذکرہ کس جگہ کیا گیا ہے؟ ان میں یہ کہاں مذکور ہے کہ اس کی جو قرأت زمانۂ نزول میں اس وقت کی جارہی ہے اس کے بعد ایک دوسری قرأت ہو گی؟ ان میں جمع و ترتیب یعنی کتابی شکل میں دینے کا تذکرہ کہاں ہے؟ کیا ان میں کتاب کا لفظ کہیں بھی پایا جاتا ہے؟ جبکہ جناب غامدی صاحب نے خود یہ اصول مقرر کئے ہیں کہ لفظ کو معروف و معنی پر حمل کیا جائے گا جس کی تفصیل گزشتہ سطور میں مسطور ہوئی ایک منصف مزاج خود ہی فیصلہ کرے کہ یہاں کتابی شکل وصورت کا ذکر ان دو آیتوں یا قرآن کی کسی بھی سورت میں کہاں پایا جاتا ہے کہ جس میں یہ وعدہ کیا گیا ہو کہ آپؐ کی حیات ہی میں قرآن کو کتابی شکل دی جائے گی یا آپؐ سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ آیتیں وحی کے ذریعے نازل ہو رہی ہیں آپ ان کو لکھوالیا

کریں۔

اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی قرأت مطلوب تھی تو پھر بقول آپ کے دو قرأتوں کی کیا ضرورت تھی کہ پہلے ایک قرأت نازل فرمادی اور پھر آخر میں کتابی شکل میں دوسری؟ شروع ہی سے کیوں ایک قرأت پر اکتفاء کیوں نہ کیا گیا؟

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم حضور علیہ السلام کے حین حیات قرآن پاک لکھتے تھے اور یاد بھی کرتے تھے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کی ایک ہی قرأت ہے دوسری قرأتیں سب غلط ہیں اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ ''سبعۃ احرف''اور باقی وہ سب احادیث غلط و بے بنیاد ہیں جو قرآن کی جمع و تالیف سے متعلق ہیں منطقیوں کے نزدیک قیاس اقترانی ہو یا شرطی واستثنائی اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں ان شرائط کے بغیر ان سے نتائج اُخذ نہیں کئے جاسکتے جناب غامدی صاحب نے مذکورہ تلازم کے بغیر نفی قرأت کا نتیجہ مرتب کرنے کی جسارت کی ہے جو بڑی غلطی ہے، جناب غامدی صاحب کو لازم ہے کہ وہ پہلے یہ ثابت کردیں کہ جو تاویل انہوں نے ان دو آیتوں کی پیش کی ہے وہ صحیح ہے پھر یہ ثابت کردیں کہ حضور علیہ السلام کے وصال کے وقت ایک ہی مصحف پر صحابہ کرام کو کاربند بنایا گیا ہو کہ اب اسی کتاب والی قرأت ہو گی اس کے سوا کوئی قرأت نہیں ہو گی۔

مفسرین کا نقطۂ نظر ان دو آیتوں کے بارے میں یہ ہے کہ ابتداء نبوت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختصر سورتیں وقفے وقفے سے تھوڑا تھوڑا کرکے

نازل کی جاتیں تاکہ آپؐ کے لئے اس قول ثقیل کاازبر کرنااور برداشت کرنا آسان ہو، چونکہ یہ سورتیں آپؐ کو زبانی سنائی جاتی تھیں اس لئے آپؐ کی کوشش ہوتی کہ وحی کو جلدی یاد فرمالیں چنانچہ آپؐ بھی حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے تو سورۃ اعلیٰ جو نزول کے اعتبار سے تقریباً آٹھویں نمبر پر ہے کی اس آیت میں آپؐ کو بتایا گیا کہ آپ بھولیں گے نہیں اور یہ کہ وحی کا سلسلہ جاری رہے گا اور جتنا قرآن نازل ہو گا وہ سب آپ کے سینے میں محفوظ کر دیا جائے گا، یہ مطلب نہیں کہ آپ کو کتابی شکل میں دیا جائے گالہذا یاد کرنے کی ضرورت نہیں بھلاآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توامی تھے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ مجھے وہ جگہ (صلح نامے میں) دکھاؤ جہاں تم نے ''رسول اللہ'' لکھا ہے،

اس لئے یہاں سینے میں جمع کر دینے کا وعدہ ہے چنانچہ تفسیر خازن میں ہے

قوله عزوجل 'سنقرئک'' ای نعلمک القرآن بقراء ۃ جبریل علیک ''فلاتنسیٰ'' یعنی مایقرأعلیک و ذالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا نزل جبریل بالوحی لم یفرغ من آخر آلایۃ حتی یتکلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باولھا مخافۃ ان ینساھا فانزل اللہ تعالیٰ ''سنقرئک فلاتنسیٰ'' فلم ینس شیئاًبعدذالک''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی لیکر جب جبریل علیہ السلام آتے تو ان کی وحی سے فراغت سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتداء سے پڑھنا شروع فرماتے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ بھول جائیں گے تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی تو آپؐ کچھ بھی نہ بھولے۔

یہی بات باقی مفسرین نے بھی کی ہے مدارک میں ہے ”سنعلمک القرآن حتیٰ لاتنساہ“ ہم آپ کو قرآن سکھادیں گے یہاں تک کہ آپ بھولیں گے نہیں اس میں ”سنقرئک“ کا مفعول قرأت نہیں بلکہ قرآن ظاہر کیا گیا ہے، اور مضارع پر لفظ ”سین“ داخل کیا گیا ہے جو مستقبل قریب کیلئے آتا ہے اگر غامدی صاحب کی تاویل کو صحیح مانا جائے تو پھر اس میں لفظ سوف ہی مناسب تھا کیونکہ دوسری قرأت تو تقریباً بیس سال کے بعد ہوئی جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے لہذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ عربیت کے حوالے سے بھی درست نہیں۔

خطیب المفسرین ابو سعود لکھتے ہیں: فهو وعد كريم باستمرار الوحی) یعنی اس آیت میں وحی کا سلسلہ جاری رکھنے کا مشفقانہ وعدہ ہے کہ وحی جیسے حالاً جاری ہے ایسا ہی تاحیات جاری رہے گی اس میں گویا وحی کے انقطاع کے اندیشے کا ازالہ مقصود ہے کہ ابتدائے نبوت میں کچھ مہینوں کے لئے جو وحی مؤخر کی گئی تھی ایسا پھر نہ ہو گا، اور نہ ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گا بلکہ تاحیات باقی، جاری وساری رہے گا۔ اور بار بار پڑھا دینا بھی مطلب ہو سکتا ہے جیسا کہ جبریل علیہ السلام ہر سال رمضان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نازل شدہ حصے کا دور فرماتے اور آخری سال دو مرتبہ دور فرمایا۔

تاہم اس آیت کریمہ میں حضور علیہ السلام کو وحی کے دوران پڑھنے سے منع نہیں کیا گیا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدت اشتیاقِ وحی کی بناء پر حضرت جبریل علیہ السلام کے فارغ و خاموش ہو جانے سے قبل ہی حسب معمول پڑھتے رہتے کچھ عرصہ بعد سورۂ قیامت جو تقریباً بیس سورتوں کے بعد نازل ہوئی کی آیت میں بتایا گیا کہ یاد کرنے کی غرض سے جلدی نہ پڑھا کریں

کہ آپ کے سینے میں جمع کرنا مطلب سمجھانا اور آپ کی زبانی لوگوں تک پہنچانا یہ سب ہمارے ذمہ ہے، چنانچہ بخاری "باب کیف کان بدؤ الوحی الٰی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی چوتھی حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

"لاتحرک به لسانک لتعجل به" قال کان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعالج من التنزيل شدةً و كان مِمَّا يحرك شفتيه فقال ابن عباس رضى الله عنهما: فانا أحَرِّ كهما لَك كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحر كهما، وقال سعيد انا احركهما كمارأيت ابن عباس رضى الله عنهما يحركهما فَحَرَّك شفتيه، فانزل الله تعالىٰ "" لاتحرك به لسانك لتعجل بهٖ ط ان علينا جمعه و قرانه صدرك وتقرأه "فاذا قرأناه فاتبع قرأنه" قال فاستمع له' وانصت "ثم ان علينا بيانه" ثم ان علينا ان تقرأه، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعدذالك اِذا اَتاه، جبرئيل استمع فاذا انطلق جبرئيل قرأه النبى صلى الله عليه وسلم كما قرأه" (ص ۳ ج ۱)

"یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وحی کو یاد کرنے اور ساتھ ہی سمجھنے کی غرض سے جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت کرکے اپنے مبارک ہونٹوں مبارک کو ہلایا کرتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تا کہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا (تیرے سینہ میں) اور پڑھنا (تیری زبان سے) جب ہم اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں یعنی خاموشی سے سنا کریں۔"

اس روایت میں "جمعه لک صدرک" رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر ہے جو یقیناً مابعد کی تمام تفاسیر پر مقدم اور راجح ہے انہوں نے پوری وضاحت سے تصریح کی ہے کہ آپؐ کو دوران وحی پڑھنے کی مشقت سے فارغ کر کے باور کرایا گیا کہ اس کو آپ کے سینے میں جمع کرنا، مطلب سے آگاہ کرنا اور پھر آپ ہی کی وساطت سے لوگوں تک پہنچانا ہمارے ذمہ ہے، چنانچہ اس کے بعد جب جبریل علیہ السلام وحی پڑھتے تو آپ خاموشی سے سنتے اور جب حضرت جبریل علیہ السلام واپس تشریف لیجاتے تو حضور علیہ السلام اسی طرح پڑھ لیتے۔

"قال جمعه لك ... قرانه" اس آیت کے نزول سے لیکر آج تک امت کے تمام مفسرین نے اسی تفسیر کو قبول اور منقول کیا ہے مگر جناب غامدی صاحب کی تحقیق کہتی ہے کہ اس سے مراد دوسری قرأت کو کتابی شکل میں دینا ہے، اب منصف مزاج خود ہی فیصلہ کرلے کہ وہ کس کے ساتھ چلنا چاہتا ہے؟

متواتر قرأتوں کے بارے میں جناب غامدی صاحب کا دعویٰ مع الدلیل آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا، ان کی دلیل میں کتنا وزن ہے یہ بھی آپ نے دیکھا، ایک منصف مزاج کیلئے اتنا ہی کافی ہے، مگر تواتر کا انکار چونکہ بڑی جسارت کی بات ہے اس لئے میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ راقم کا نقطۂ نظر متواتر قرأتوں کے اثبات کے حوالے سے "سبعۃ احرف" کی بنیاد پر مبنی نہیں ہے کیونکہ قرأتوں کو اس حدیث سے جوڑنا بقول سیوطی رحمہ اللہ کے ایک عامیانہ استدلال ہے: وقدظن کثیر من العوام ان المراد بها القراءات السبعة وهو جهل قبیح" (اتقان ص۶۶ ج امیر محمد کتب خانہ کراچی)

متواتر قرأتوں کی دلیل بس یہی ہے کہ وہ عملی تواتر سے ثابت ہے اس پر قراء و مفسرین اور محدثین وغیرہ ناقلین کا اجماع ہے خواہ کسی کلمہ میں سات قرأتوں سے کم ہوں یا زیادہ۔ ایک سے زائد قرأتوں پر کبھی بھی پابندی نہیں رہی ہے البتہ رسم الخط ایک ہی ہے اور یہ وہی رسم الخط ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف کے مطابق ہے باقی مصاحف جن جن رسم الخطوط کے مطابق تھے اختلافِ امت سے بچنے کیلئے وہ ممنوع قرار پائے چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں: **وقد اجمع الصحابة علی نقل المصاحف العثمانية من الصحف التی کتبها ابو بکر و اجمعوا علیٰ ترک ماسویٰ ذالک** (ص۶۶ حصہ اول میر محمد کتب خانہ)

تحقیق صحابہ کرام مصاحف عثمانیہ کو ان صحیفوں سے نقل کرنے پر اجماع کر چکے ہیں جو حضرت ابو بکر ؓ نے لکھوالئے تھے اور باقی سب (رسم الخط) کو ترک کرنے پر بھی اجماع کر چکے ہیں۔

قرأت متواتر ''سبعۃ احرف'' کی حدیث سے ہٹ کر اپنی مضبوط بنیاد، تواتر عملی و قولی پر قائم ہیں اس لئے ''سبعۃ احرف'' کی حدیث اگر ثابت نہ بھی ہو تب بھی اس سے قرأتوں کی نفی میں کوئی مدد نہیں ملتی ہے مگر پھر بھی مناسب لگتا ہے کہ اس موضوع کو تھوڑا سا اُجاگر کیا جائے۔

''سبعۃ احرف'' کی حدیث متواتر ہے اور امام زہری کے علاوہ اس کے بہت سے طرق ہیں۔ جنکی تعداد کل ملا کر ایک سو ساٹھ سے متجاوز ہیں گو ان میں بعض مرسل احادیث بھی ہیں اور جو بعض ضعیف ہیں ان کا جبیرہ عام قاعدے کے مطابق کثرت اسانید اور صحاح سے ہو جاتا ہے، یہاں پر وہ تمام اسانید بالتفصیل

نقل کرنا مشقت سے خالی نہیں اس بناء پر مختصر اًو اجمالاً ان کتب کے نام پیش کئے جارہے ہیں جن میں یہ احادیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے مروی ہیں (۱) مسند الحارث میں یہ روایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ص ۲۷ پر آئی ہے اسی طرح (۲) مجمع الزوائد ص ۳۲ پر بھی ہے (۳) طبقات المحدثین من حدیث ابن عمر ؓ (۴) سنن ابی داوٗد (۵) الاحادیث المختارۃ میں یہ حدیث ابی بن کعب ؓ سے متعدد طرق سے مروی ہے (۶) السنن الصغریٰ (۷) السنن الکبریٰ للنسائی (۸) عمل الیوم واللیلہ (۹) مسند احمد میں کئی طرق سے آئی ہے (۱۰) التمھید لابن عبدالبر میں تفصیلی بحث کے ساتھ (۱۱) صحیح ابن حبان (۱۲) معجم الاوسط (۱۳) الکامل فی ضعفاء الرجال (۱۴) الجامع لمعمر بن راشد اور کئی طرق سے (۱۵) صحیح مسلم میں (۱۶) مصنف ابن ابی شیبہ (۱۷) المستخرج علی صحیح مسلم متعدد طرق (۱۸) سنن البیھقی الکبری (۱۹) المعجم الصغیر للطبرانی (۲۰) مسند الطیالیسی (۲۱) المعجم الکبیر للطبرانی (۲۲) حلیۃ الاولیاء متعدد طرق (۲۳) طبقات المحدثین باَصفہان (۲۴) الاحکام لابن حزم (۲۵) دلائل النبوۃ (۲۶) مسند عبد بن حمید (۲۷) سنن الترمذی (۲۸) التدوین فی اخبار قزوین (۲۹) نیز بخاری شریف (۳۰) موطاء مالک وغیرہ کتب میں بہت سے طرق سے مختلف صحابہ کرام سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے جبکہ مراسیل ان کے علاوہ ہیں۔

لہٰذا اس حدیث کے بارے میں محدثین کرام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی صحت میں کوئی اختلاف یا شک نہیں ہے چنانچہ احمد شاکر فرماتے ہیں "والحدیث صحیح لا خلاف فی صحتہ" "حاشیۃ الرسالۃ" امام شافعی ص ۲۵۳ فقرہ ۷۵۲

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: قال ابو عمر: لا خلاف فیہ عن مالک فی متن

هذاالحدیث (التمهید ص۲۷۲ج۸)

الدکتور عبداللہ بن محمد حسن، امام دارقطنی کا یہ مقولہ نقل کرتے ہیں:

وکلھا صحاح محفوظة عن الزھری اخرجه مسلم و بخاری من حدیث ھو لاء النفر (مرویات امام الزھری المعلة ریاض) اس لئے اصولی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ متواتر کا انکار موجب کفر ہونے کی وجہ سے اس حدیث کا انکار انتہائی خطرناک بات ہے اگر اسے متواتر نہ بھی مانا جائے تو اس کی اسانید میں کم از کم اتنی قوت ضرور ہے کہ اس کا منکر بلاشبہ فاسق ہوجاتا ہے۔

جہاں تک جناب غامدی صاحب کے اعتراضات کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعتراضات میں اتنی جان نہیں جو اس حدیث کی صحت پر اثر انداز ہوسکے، اگر ان کے نزدیک اس حدیث کا مفہوم ایک معما ہے جیسا کہ انہوں نے پہلے استدلال و اعتراض میں موقف اپنایا ہے تو اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ کثرت تاویلات سے اس کا مفہوم زیادہ سے زیادہ مُرَدّد بن جائے گا کہ اس کے معنی میں جو چالیس اقوال کئے گئے ہیں ان میں کوئی ایک تو صحیح ہوگا یہ تو لازمی نہیں کہ اس کی حقیقت ہی باطل ہوجائے جیسا کہ مفہوم مردد کا حکم ہے مثلاً کوئی یہ کہے کہ زید یا گھر میں ہوگا یا مسجد میں یا پھر ان کے علاوہ کہیں اور ہوگا جیسے بازار، پارک اور حمام وغیرہ میں تو اس سے زید کی کسی جگہ یقینی موجودگی اگرچہ معلوم نہ ہوسکے گی اور سننے والے کو شک اور تردد کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن یہ شک مخصوص جگہ میں موجودگی کے بارے میں ہوگا نہ کہ زید کی اپنی موجودگی کی بابت وہ تو یقینی موجود ہے، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کے کثرت مطالب بیان کرنے سے متعین معنی مشکوک ضرور ہوئے لیکن اس

سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سرے سے یہ حدیث ہی بے بنیاد قرار دی جائے۔ بہر حال اس کا مطلب مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور شرح عقائد میں ہے کہ قرآن و سنت جس امر ممکن کی خبر دیں، اس کی تصدیق واجب اور وقوع حق و سچ ہوتا ہے۔

''ثانیا'' یہ حدیث زیادہ سے زیادہ متشابہ بن سکتی ہے جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں موقف اختیار کیا ہے، لیکن متشابہات پر بھی ایمان لانا لازمی ہے گو ان کا مطلب سمجھ میں نہ آتا ہو۔

ان کے دوم اور سوم اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ ''سبعۃ احرف'' کو عربوں کے مختلف لغات پر محمول کرنا واحد معقول توجیہ قرار دینا درست نہیں یہ دراصل ایک غلط فہمی ہے جو قبائلی نظام پر قلت تدبر سے ناشی ہے اس کی یہ بھی توجیہ معقول ہے کہ ''سبعۃ احرف'' سے مراد مترادفات ہوں اور ایک ہی قبیلے میں یہ ممکن ہے بلکہ واقع بھی ہے خصوصاً عربی جیسی وسیع زبان میں تو اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں چونکہ نو مسلموں کیلئے قرآن یاد کرنا اور بالکل صحیح پڑھنا دشوار تھا اس لئے ان کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ اگر وہ صفت کو صفت سے تبدیل کر دیں اور معنی تبدیل نہ ہو تو اس پر پابندی نہیں چنانچہ ابو داؤد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''ان قلتَ سمیعاً علیماً، عزیزاً حکیماً مالم تختم أیۃ عذاب برحمۃ او أیۃ رحمۃ بعذاب'' (ص ۲۰۸ ج ا میر محمد کتب خانہ) یعنی جس آیت میں عذاب کا ذکر ہو وہ رحمت کے تذکرہ پر ختم نہیں ہونا چاہئے اور جس آیت میں رحمت کا تذکرہ ہو وہ عذاب کے ذکر پر ختم نہیں ہونا چاہئے۔ ابو داؤد نے اس حدیث پر سکوت فرمایا ہے دیکھئے ''باب انزل

القرآن علی سبعة احرف"

چونکہ بہت سے الفاظ اور صفات کے درمیان ایک باریک فرق ہوتا ہے اور دائرۂ اسلام میں نئے داخل ہونے والے کیلئے ان میں تمائز اور فرق کرنا اور یاد کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جیسے خالق اور باریٔ، عالم اور علیم، ماجد اور مجید، غفور عفو، رؤف اور رحیم وغیرہ وغیرہ اسی بنا پر یہ بات مستبعد نہیں کہ شروع اسلام میں خصوصاً نوواردوں کیلئے اس کی گنجائش رکھی گئی ہو تاہم جب لوگ اسلوب قرآن سے واقف ہوگئے اور حفاظ کی تعداد بڑھ گئی، لکھنے پڑھنے کا رواج فروغ پاچکا اور قرآن مصحف کی شکل میں مدون ہوا تو اس رخصت کو ختم کردیا گیا اور عرضہ اخیرہ کی قرأت کو باقی رکھا گیا، امام طحاوی فرماتے ہیں: **وانما کان ذالک رخصة لما کان یتعسر علی کثیر منھم التلاوة بلفظ واحد لعدم علمھم بالکتابة والضبط و اتقان الحفظ ثم نسخ بزوال العذر و تیسیر الکتابة و الحفظ** (الاتقان ص ۲۷) یعنی اس طرح پڑھنے کی اجازت اس وقت تھی جب بہت سے لوگوں کیلئے ایک ہی طرح تلاوت کرنا مشکل تھی (یعنی نو مسلموں کیلئے) کہ ان کیلئے لکھنا اور یاد کرنا مشکل تھا پھر جب لکھنا اور یاد کرنا آسان ہوگیا تو یہ رخصت ختم کردی گئی۔ چونکہ حضرت ہشام بن حکیم فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے اس لئے ان کے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پڑھنے میں فرق کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، کیا مکہ والے اپنے بچے دودھ پلانے کے لئے دور افتادہ دیہاتوں میں نہیں بھیجتے تھے؟ اس کا اہم مقصد یہی تو تھا کہ وہ فصیح اور اصلی لغات یاد کرلیں کیونکہ شہری زبان دیگر لغات کے ساتھ مخلوط ہوجاتی ہے، کیا اردو جیسی بساط یسیر کی زبان میں لوگ ایک ہی معنی کو مختلف عنوانات و تعبیرات

سے ادا نہیں کرتے ہیں اگر چہ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اب مترادفات کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اس کی بلاغت اور اعجاز بلکہ بسا اوقات مطلب ہی تبدیل ہو جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ جب اس کی اجازت تھی تو وہ اپنی صوابدید پر نہ تھی بلکہ حضور علیہ السلام کی اجازت سے یعنی ان سے الفاظ کی باقاعدہ اجازت لیکر لوگ پڑھتے تھے، اس کے ساتھ ان کے چوتھے اعتراض کا جواب بھی ہو گیا۔

رہا جناب غامدی صاحب کا پانچواں اعتراض جو انہوں نے امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ پر کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام زہری جیسی ہستی اگر ناقابل بھروسہ ہیں تو پھر صحابہ کرام کے بعد کون بااعتماد رہ سکتا ہے؟

امام زہری کی جلالت شان

امام زہری رحمہ اللہ کی ثقاہت مسلم ہے یہ نہ صرف صحاح اور مسلم و بخاری کے رجال و راویوں میں سے ہیں بلکہ امام مالک جیسے امام کے استاذ بھی ہیں اگر امام زہری کو ناقابل اعتبار قرار دیا جائے تو مؤطا مالک کی تقریباً آدھی روایات یا کم از کم ایک تہائی احادیث خود بخود ضعیف ہو جائیں گی کیونکہ امام مالک کی روایات بواسطہ زہری مؤطا میں پچیس، تیس فیصد سے زیادہ ہیں، نیز یہ بھی لازم آئے گا کہ امام مالک رحمہ اللہ جیسے محتاط اور متورع شخص نے احادیث سننے میں کوئی احتیاط نہیں کی بلکہ ایک ایسے شخص سے بھی روایات نقل کی ہیں جس کے بارے میں جناب غامدی صاحب کی عدالت کا فیصلہ ہے:

”آئمہ رجال انھیں تدلیس اور ادراج کا مرتکب تو قرار دیتے ہی ہیں اس

کے ساتھ اگر ان کے وہ خصائص بھی پیشِ نظر رہیں جو امام لیث ابن سعد نے امام مالک کے نام اپنے ایک خط میں بیان فرمائے ہیں تو ان کی کوئی روایت بھی، بالخصوص اس طرح کے اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی'' (اصول و مبادی ص ۳۵)

دیکھئے جناب غامدی صاحب بطور سلب کلی امام زہری کی کوئی بھی روایت بالخصوص اہم مسائل میں قابل قبول نہیں سمجھتے، لہذا اس سے بقول جناب غامدی کے نہ صرف موطا کی وہ تمام روایات ضعیف بن گئیں بلکہ بخاری و مسلم وغیرہ کی وہ جملہ احادیث بھی ان کے اس فیصلے سے معدوم بن گئیں جو زہری سے مروی ہیں جن آئمہ نے ان سے روایات لی ہیں وہ بھی مشکوک اور ناقابل بھروسہ بن گئے، بتایئے پھر کون بچا جس کی حدیث پر اعتماد کیا جا سکے؟ کیا یہ انکار حدیث کی راہ ہموار کرنے کی کوشش نہیں ہو سکتی؟

امام زہری کے فضائل تو بہت زیادہ ہیں تاہم اختصار کے پیشِ نظر یہاں ''اِکمال فی اسماء الرجال لِصاحب المشکوٰۃ'' کی عبارت پیش ہے وہ لکھتے ہیں: **الزھری ھو منسوب الی زھرۃ بن کلاب ممن اشتھر بالنسب الیھم ھو ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن شھاب احد الفقھاء و المحدثین و العلماء الاعلام من التابعین با لمدینۃ المشار الیہ فی فنون علوم الشریعۃ، سمع نفراً من الصحابۃ، روی عنہ خلق کثیر منھم قتادۃ و مالک بن انس، قال عمر بن عبدالعزیز: ''لا اعلم احداً اعلم بسنۃ ماضیۃ منہ، قیل لمکحول: من اعلم من رأیت؟ قال ابن شھاب، قیل لہ، ثم من؟ قال: ابن شھاب، قیل ثم من؟ قال: ابن شھاب، مات فی شھر رمضان سنۃ اربع و عشرین و مائۃ**

(اکمال حرف الزاء فصل فی التابعین)

یعنی امام زہری، زہرہ بن کلاب (قبیلہ) کی جانب منسوب ہیں دیگر کی طرح یہ بھی اپنے قبیلے کی نسبت سے جانے جاتے ہیں ان کا پورا نام ابو بکر محمد بن عبداللہ ابن شہاب ہے بڑے فقہاء، محدثین و علمائے تابعین میں سے ہیں اور مدنی ہیں علوم شریعت کے فنون میں شہرت یافتہ تھے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے روایات سنی ہیں اور ان سے بڑی خلقت نے احادیث نقل کی ہیں جن میں قتادہ اور امام مالک بطور خاص قابل ذکر ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: مجھے سنت جاریہ کا ان سے بڑا عالم معلوم نہیں۔ حضرت مکحول سے کہا گیا کہ آپ نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ابن شہاب (زہری) ان سے دوبارہ سوال ہوا کہ پھر کون ہے؟ جواب دیا: ابن شہاب سہ بارہ پھر سوال دہرایا گیا کہ ان کے بعد کون ہے؟ انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ: ابن شہاب (یعنی ان کے ہوتے ہوئے اور کون بڑا عالم کہلانے کا مستحق ہے) امام زہری کی وفات ماہ رمضان ۱۲۴ ھجری کو ہوئی۔

رہا جناب غامدی صاحب کا یہ الزام کہ زہری مدلس تھے اور تدلیس کیا کرتے تھے تو ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تدلیس ہر ایک راوی پر یکساں منفی اثر نہیں کرتی بلکہ تابعی اور مابعد کے راویوں میں فرق ہوتا ہے نیز ثقہ اور غیر ثقہ میں بھی فرق ہوتا ہے یہ دیکھنا لازمی ہے کہ راوی ثقات سے تدلیس کرتا ہے یا ضعاف سے، اور یہ کہ جس روایت میں تدلیس کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ روایات بھی ناقابل قبول ہو جاتی ہیں جو بغیر تدلیس کے روایت کرتا ہے اور جن

میں عن کے بجائے تحدیث کی تصریح ہوتی ہے؟ اور یہ کہ اس نے جس روایت میں تدلیس کی ہے آیا اس کی توثیق یا نفی میں باقی روایات پائی جاتی ہیں یا نہیں، لھذا ان تمام تدابیر کو نظر انداز کر کے صرف تدلیس کا ٹھپہ لگا کر کسی روایت کو رد کرنا اصول کی بات نہیں ہے جبکہ تدلیس کی سب اقسام بھی یکساں نہیں ہیں۔

اور جہاں تک امام لیث بن سعد کے خط کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ لیث بن سعد نے امام زہری کا مذہب ترک کیا تھا جس کا پس منظر یہ ہے کہ امام لیث کا امام زہری سے چند مسائل پر اختلاف تھا جیسے مہر معجّل اور بارش والی رات کو مغرب و عشاء کی دونوں نمازیں ایک ساتھ ادا کرنے کا مسئلہ جس پر حضرت لیث نے امام مالک کو لکھا تھا کہ زہری بارش کی صورت میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتے ہیں چونکہ مدینہ منورہ میں تو بارشیں کم ہوتی ہیں لیکن یہاں شام اور اسکندریہ کی سرزمین پر بارشوں کا سلسلہ اکثر جاری رہتا ہے اگر ہم اس طرح جمع بین الصلوٰتین پر عمل کریں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم یہ دونوں نمازیں زیادہ تر ایک ساتھ ادا کر کے وقت کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔

یہ طے شدہ ہے کہ کسی وجہ سے کسی امام کے مذہب کو ترک کرنے سے متعلقہ امام کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا ورنہ تو تقریباً سارے آئمہ مجروح ہو جائیں گے۔ دیکھئے امام طحاوی نے امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ترک کر کے امام ابو حنیفہ کا مذہب اختیار کر لیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ امام شافعی کی کوئی روایت اور بالخصوص اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی؟ اہم بات

یہ ہے کہ اس خط پر امام مالک رحمہ اللہ نے کوئی عمل نہیں کیا جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ موطأ مالک میں زہری کی روایت بکثرت پائی جاتی ہیں عموماً باب کی پہلی روایت زہری ہی سے ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ امام زہری کی روایات میں تناقض ہوتا تھا جیسا کہ اس خط میں کہا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر تضادِ روایت سے ترکِ راوی لازم نہیں آتا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی دو راویوں کے درمیان اختلافِ روایت کے باوجود دونوں ثقہ ہوتے ہیں اسی طرح کبھی ایک راوی کی روایت میں اختلاف ہوتا ہے لیکن وہ چونکہ ناقل ہوتا ہے اس لئے وہ کمال احتیاط کی بناء پر ہر دو الفاظ نقل کرتا ہے کہ فلاں نے یہ لفظ کہا ہے اور فلاں نے وہ لفظ بولا ہے۔ اس کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں خاص کر بخاری میں ۔ البتہ اگر ایک ہی راوی ایک وقت میں ایک لفظ بولے اور دوسرے وقت میں دوسرا لفظ تو دیکھا جائے گا کہ وہ یہ کام وضع احادیث کی نیت سے کرتا ہے یا نسیان کی وجہ سے اگر وہ بدنیتی کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا ہو بلکہ نسیان سے یا روایت بالمعنی کو جائز سمجھ کر روایت کرتا ہو اور اس تغییر سے معنی و مطلب پر اثر نہ پڑتا ہو تو اس سے کچھ نہیں ہوتا اگرچہ نسیان کی وجہ سے راوی مجروح ہوجاتا ہے مگر روایت کے بارے میں ضابطہ ایسی صورت میں یہ ہے کہ اس روایت کے دیگر متابع تلاش کرنے ہوں گے جس کی تفصیل اصول کی کتابوں میں درج ہے، اگر کوئی راوی بدنیتی کی وجہ سے الفاظ تبدیل کرتا ہو تو بلاشبہ اس سے روایت اور راوی دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں لیکن امام زہری کی شان اس سے بہت رفیع و بالاتر ہے کہ وہ وضع احادیث کا تصور کریں۔ اور خود اس خط کے الفاظ بھی اس صورت کی نفی کرتے ہیں "ولایشعر بالذی مضیٰ من رأیه فی

ذالک" کہ ان کو اس بارے میں اپنی سابقہ رائے کا پتہ نہیں ہوتا ہے۔

اس لئے کہا جائے گا کہ یہ اختلاف وہ تضاد نہیں ہے جس سے امام زہری کی جلالت شان میں کمی آجائے علیٰ ھذا ایسے میں امام لیث کا امام زہری کو چھوڑنا یا تو کمال احتیاط پر مبنی ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ امام لیث روایت بالمعنی کے جواز کے قائل نہ ہوں جبکہ جمہور کے نزدیک یہ جائز ہے خصوصاً ماہرین کیلئے جو یہ جاننے کی بھرپور قدرت رکھتے ہوں کہ کس لفظ سے اصلی معنی ادا کئے جاسکتے ہیں اور کس لفظ سے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ذیل میں صحیح بخاری کی ایک حدیث بطور مثال پیش ہے جس میں الفاظ کے اختلاف کے باوجود روایت صحیح ہے **"حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا سُفین غیر مرۃ عن الزہری قال سمعت انس بن مالکٍ یقول : سقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن فرسٍ و ربما قال سفین من فرس، فَجُحِشَ شقہ الایمن فدخلنا علیہ نعودہ فحضرت الصلوٰۃ فصلی بنا قاعداً و قعدنا وقال سُفین مرۃ صلینا قعوداً فلماّ قَضَی الصلوٰۃ قال: انما جعل الامام لیؤ تم بہ فا ذا کبر فکبروا و اذا رکع فارکعوا و اذا رفع فارفعوا و اذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا و لک الحمد و اذا سجد فاسجدوا، کذاجاء بہ معمر؟ قلت نعم قال لقد حَفِظَ، کذاقال الزہری ولک الحمد حَفِظتُ "من شقہ الایمن" فلما خرجنا من عندالزہری قال ابن جُریج: و انا عندہ فجش ساقہ الایمن"**

(ص ۱۱۱ ج ۱، باب یہوی بالتکبیر الخ)

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام گھوڑے سے گر گئے تھے، سفیان بجائے لفظ "عن" کے "من" ذکر کرتے ہیں تو آپ ؐ کا داہنا پہلو چھل گیا

تھاہم ان کی عیادت کی غرض سے ان کے پاس گئے، اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور ہم بھی بیٹھ گئے، سفیان نے ایک مرتبہ کہا کہ ہم نے بیٹھ کر نماز پڑھی جب آپؐ نماز پڑھا چکے تو فرمایا کہ امام اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تا کہ اس کی اقتدا کی جائے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر پڑھو، جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کیا کرو اور جب وہ (رکوع سے) اٹھے تو تم بھی اٹھو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم بولو "ربنا ولک الحمد" اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔

چونکہ امام زہری کے شاگرد لیث بن سعد "ربنا لک الحمد" بغیر واو کے نقل کرتے اس لئے سفیان نے اپنے اور لیث کے شاگرد علی بن عبداللہ سے پوچھا کہ معمر بھی اسی طرح یعنی "واو" کے ساتھ نقل کرتے ہیں علی نے کہا "ہاں" سفیان نے کہا انہوں نے صحیح یاد کیا ہے یعنی اس میں "واو" ہے کیونکہ زہری نے "ولک الحمد" کہا تھا، سفیان کہتے ہیں میں نے زہری سے "شقه الایمن" یاد کیا ہے مگر جب ہم زہری کے یہاں سے نکل گئے تو ابن جریج نے کہا کہ میں زہری کے پاس تھا انہوں نے بجائے شقہ کے "ساقه الایمن" کہا ہے۔ دیکھئے اس روایت میں "عن" اور "من" کا اختلاف ہے اور "وقعدنا" اور "صلینا قعوداً" کا اختلاف ہے تیسرا اختلاف یہ ہے کہ آیا "ولک الحمد" واو کے ساتھ پڑھا جائے گا یا بغیر واو کے چوتھا اختلاف یہ ہے کہ "شقه الایمن" داہنا پہلو کے الفاظ ہیں یا "ساقه الایمن" داہنی پنڈلی کے الفاظ ہیں اور پانچواں اختلاف یہ ہے کہ "من شقه الایمن" ہے یعنی لفظ "مِن" کے ساتھ ہے یا صرف "شقه الایمن" بغیر من کے ہے۔

چونکہ احادیث کا ذوق رکھنے والا ہر شخص بلکہ ہر منصف مزاج جانتا ہے کہ یہ ایسا اختلاف نہیں کہ اس سے حدیث ضعیف بن جائے اس لئے یہ حدیث بلاشبہ صحیح ہے اور تطبیق انتہائی آسان ہے۔اس لئے بخاری نے ذکر فرمائی یہ روایت بھی امام زہری ہی کی ہے اس کی روایت میں خود لیث بن سعد، ابن جریج، معمر اور سفیان جیسے بڑے بڑے راوی شریک ہیں لہٰذا اگر نفس اختلاف موجب ضعف ہوتا تو یہ روایت بھی ضعیف ہوتی اور امام زہری اس کی بنا پر نشان تنقید بنتے مگر کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے اس لئے جناب غامدی صاحب کی یہ تنقید قابل التفات نہیں۔

محکم و متشابہ

جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں: ''یہ بات صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیز نہیں کرسکتے، یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں، قرآن کی وہ سب آیتیں محکم ہیں جن پر اس کی ہدایت کا مدار ہے اور متشابہات صرف وہ آیتیں ہیں جن میں آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت یا نقمت کا بیان، تمثیل اور تشبیہ کے انداز میں ہوا ہے یا اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال اور ہمارے علم اور مشاہدے سے ماوراء اس کے کسی عالم کی کوئی بات تمثیلی اسلوب میں بیان کی گئی ہے'' (اصول و مبادی ص ۳۸) وہ مزید لکھتے ہیں۔ ''قرآن کی جس آیت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ متشابہات کا مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ متشابہات کے

معنی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا'' (ایضاص ۳۹)

المسترشد:۔ چونکہ جناب غامدی صاحب یہ اصول طے کر چکے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کے صرف واحد معروف معنی ہی لئے جائیں گے ان سے ہٹ کر اس کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جاسکتی'' اصول ومبادی ص ۲۰،

اور ص ۶۴ پر اپنے استاد کی عبارت ''تدبر قرآن'' کے حوالے سے نقل کر کے لکھتے ہیں ''میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہئے کہ ''مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا'' انتھیٰ

اس موقف کی بنا پر جناب غامدی صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ متشابہات صرف وہ آیتیں ہیں جنکا تعلق ماورائے مشاہدہ وعقل سے ہوتا ہے راقم پہلے بارہا عرض کر چکا ہے کہ یہ لوگ اپنا ایک معیار مقرر کر لیتے ہیں اور پھر نصوص کو اسی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ جمہور محکم و متشابہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ محکم وہ ہے جس کے معنی متعین ہوں اس کے معنی مراد میں ابہام یا دوسرا احتمال نہ ہو جبکہ متشابہ کے معنی مراد غیر متعین ہوتے ہیں کہ اس میں دوسرا احتمال بھی ہوتا ہے اس لئے متشابہ کا مطلب اور حکم محکم کے تناظر میں سمجھنا چاہئے اور یہ تعریف جناب غامدی صاحب کے اصول سے متصادم ہے اس لئے انہوں نے جمہور کا راستہ چھوڑ کر نیا راستہ بنایا۔ حالانکہ سورۂ ''ال عمران کی

آیت نمبر ۷ سے جمہور کی واضح تائید ہوتی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں:

ھوالذی انزل علیک الکتٰب منہ ایت محکمٰت ھن ام الکتٰب و اخر متشابھات ط فاما الذین فی قلو بھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ و ابتغاءتاویلہ ج

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی انکے معنی واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور (من پسند) مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔

جمہور مفسرین نے اس آیت کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے اس کا خلاصہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' مانتے ہیں بس ہمارے اثبات مدعا کیلئے یہ الفاظ کافی ہیں۔ یہاں اسکا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات و مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اسکو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو خواہ اس لئے کہ لغت اور ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے الفاظ میں کوئی ابہام و اجمال نہیں نہ عبارت کئی معنیٰ کا احتمال رکھتی ہے نہ جو مدلول سمجھا یا گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے مخالف ہے۔ اور یا اس لئے کہ عبارت و الفاظ میں گو لغۃً کئی معنیٰ کا احتمال ہو سکتا تھا لیکن

شارع کی نصوص مستفیضہ یا اجماع معصوم یا مذہب کے عام اصول مسلمہ سے قطعاً متعین ہوچکا، کہ متکلم کی مراد وہ معنیٰ نہیں، یہ ہے، ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں اور فی الحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی جڑ اور اصول یہ ہی آیات ہوتی ہیں۔ دوسری قسم آیات کی ''متشابہات'' کہلاتی ہے۔ یعنی جنکی مراد معلوم و متعین کرنے میں کچھ اشتباہ و التباس واقع ہوجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری قسم کی آیات کو پہلی قسم کی طرف راجع کرکے دیکھنا چاہئے جو معنیٰ اسکے خلاف پڑیں انکی قعطاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو ''آیات محکمات'' کے مخالف نہ ہو۔ اگر باوجود اجتہاد وسعی بلیغ کے متکلم کی مراد کی پوری پوری تعیین نہ کرسکیں تو دعویٰ ہمہ دانی کرکے ہم کو حد سے گزرنا نہیں چاہئے۔ جہاں قلت علم اور قصور استعداد کی وجہ سے بہت سے حقائق پر ہم دسترس نہیں پاسکتے اس کو بھی اسی فہرست میں شامل کرلیں۔ مگر زنہار ایسی تاویلات اور ہیر پھیر نہ کریں جو مذہب کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہوں مثلاً قران حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کردی ''ان ھو الا عبد انعمنا علیه'' (وہ کیا ہے ایک بندہ ہے ہم نے اس پر فضل کیا) یا ''ان مثل عیسیٰ عند اللّٰہ کمثل ادم خلقه من تراب'' (بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی بنایا اس کو مٹی سے الخ) یا ''ذلک عیسیٰ ابن مریم قول الحق الذی فیه یمترون ما کان لله ان یتخذ من ولد سبحانه'' (یہ ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا سچی بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں اللہ ایسا نہیں کہ رکھے اولاد وہ پاک ذات ہے) اور جابجا انکی الوہیت اور ابنیت کا رد کیا۔ اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کرکے ''کلمته' القاھا الیٰ مریم و روح منه'' (اسکا کلام ہے جس

کو ڈالا مریم کی طرف اور روح ہے اسکے ہاں کی) وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اسکے وہ معنیٰ چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں ایسے سطحی معنی لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے منافی ہوں، یہ کج روی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہو گی بعض قاسی القلب تو چاہتے ہیں کہ اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہی میں پھنسا دیں اور بعض کمزور عقیدہ والے ڈھلمل یقین ایسے متشابہات سے اپنی رائے و ہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے وہی کرم سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات و متشابہات سب کو حق جانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آتی ہیں جن میں تناقض و تہافت کا امکان نہیں۔ اسی لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب سمجھتے ہیں۔ اور جو حصہ انکے دائرہ فہم سے باہر ہوتا ہے اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہی بہتر جانے ہم کو ایمان سے کام ہے'' (تفسیر عثمانی)

حدیث سے قرآن کی تخصیص

جناب غامدی صاحب حدیث سے قرآن پاک کی تنسیخ یا تحدید و تخصیص میں سے کسی بھی پہلو کے قائل نہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے،

قرآن کے بعض اسالیب اور بعض آیات کا موقع و محل جب لوگ نہیں سمجھ پائے تو ان سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی صحیح نوعیت بھی ان پر واضح نہیں ہو سکی۔ اس طرح کی جتنی مثالیں بالعموم پیش کی جاتی ہیں ان سب کا معاملہ یہی ہے ذیل میں ہم ان میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر وضاحت کے ساتھ بیان کئے دیتے ہیں۔

نمبر ۱:۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو جانور پیدا کئے ہیں ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں۔ یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے اس لئے ان سے اِبا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی اور وہ بغیر تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے، اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے، وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دستر خوان کی لذت کے لئے نہیں، سواری کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ (اصول ومبادی ص ۴۱)

المسترشد:۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ حدیث سے قران کی تخصیص کی نوعیت کیا ہے وہاں عرض کیا جاچکا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک تخصیص کے لئے خبر متواتر یا کم از کم خبر مشہور کا ہونا لازمی ہے جبکہ حنابلہ اور شافعیہ کے ہاں خبر واحد سے بھی تحدید و تخصیص جائز ہے غرض حدیث سے کسی نہ کسی صورت میں تحدید و تخصیص بالاجماع جائز ہے اس بارے میں آئمہ میں سے کسی سے کوئی اختلاف منقول نہیں ہے مگر جناب غامدی صاحب اس اجماع واتفاق کو سوء فہم اور

قلت تدبر کا نتیجہ قرار دیکر یکسر مسترد کرتے ہیں اور دلیل کے طور پر اس کی چند مثالیں دیکر باقی کو ان پر قیاس کیا ہے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جو چھ مثالیں پیش کرکے ان کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے وہ انکے دعویٰ کو جزوی طور پر بھی ثابت کرنے سے قاصر ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا عبارت میں پہلی مثال دی گئی ہے، جناب غامدی صاحب کے دعوی کے مطابق انسانی فطرت یہ فیصلہ کرنے میں خود کفیل ہے کہ اسے کونسے جانور کھانے چاہئے اور کن سے اجتناب برتنا چاہئے گویا اس علم کے حصول کے لئے حدیث کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت نہیں جو لوگ یہ علم حدیث سے اخذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا فہم و تدبر قلیل ہے۔

ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ دبستان شبلی کی کارستانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلاف وفقہاء کے علم کو غلط قرار دیکر دین کی من پسند تشریح عوام پر مسلط کرنے کی نامبارک کوشش کی جاتی ہے، جس کی ضرورت کچھ بھی نہیں اور ضرر بہت ہے۔

جناب غامدی صاحب کی اس عبارت میں دو باتیں بطور خاص قابل غور ہیں۔

نمبرا:۔ ایک یہ کہ انسان فطرت کے مطابق ''بغیر کسی تردد کے فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے''

نمبر۲:۔ دوم یہ کہ انسان اسی فطری طور پر ''جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دستر خوان کی لذت کے لئے نہیں، سواری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں''

قارئین جانتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں حقائق سے آنکھیں پھیرنے کے مترادف ہیں کیونکہ کسی چیز کے لئے فطرت کو مدار و معیار بنانے کا دارومدار

فطرت کی سلامتی پر موقوف ہے ورنہ ماننا پڑے گا کہ چائنا کے لوگوں کا مردار جانور کھانا بھی فطری ہے اور ہندوستان کے ہندوؤں کا حلال جانداروں سے اجتناب بھی فطرت کے مطابق ہے دراں حالیکہ یہ دونوں رویئے اور طرز عمل خلاف فطرت ہیں اس کی توجیہ میں جناب غامدی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان اقالیم کے لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہے لہذا وہ معیار نہیں رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی فطرت کیوں مسخ ہو چکی؟اس کی اگر ہم ہزار توجیہات و تاویلات کردیں تو بالآخر نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ لوگ شریعت سے رہنمائی حاصل نہ کرنے کی بنا پر محروم فطرت ہو گئے اور ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے یہی لازم آتا ہے کہ انسان اگرچہ اپنی پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے مگر گندہ ماحول اور غلط رہنمائی اسے فطرت سے دور لے جاتی ہے صرف وہی لوگ فطرت کی رسی کو تھامے ہوئے ہیں جو شریعت کے بنائے ہوئے اصول اور بتلائے ہوئے راستے پر گامزن ہیں، اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی فطری صلاحیت کے باوجود حلت و حرمت کے مسائل میں شارع علیہ السلام کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح ایک ذہین بچہ اپنی ذہانت کے باوجود ماہر استاذ کا محتاج ہوتا ہے اگر ایک ذکی بچے کو استاذ کے پاس نہ بٹھایا جائے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ ڈاکٹر بن جائے گا، اسی طرح کوئی انسان شریعت اور حدیث کی روشنی کے بغیر حلال و حرام کا سلیقہ کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا، غرض ہر انسان کو فطرت کے علاوہ رہنما اصول کی ضرورت ہر وقت درپیش رہتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ کونسی چیز اس کی فطرت کے مطابق و موافق ہے اور کونسی مخالف ہے، اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو پھر انبیاء علیھم السلام کی بعثت کا فلسفہ

کمزور ہو جاتا حالانکہ جناب غامدی صاحب اپنی کتاب اصول و مبادی کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

''دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اس کے بعد اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے''(ص۹)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب غامدی صاحب اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ تنہا انسانی فطرت حلت و حرمت کے فیصلے کی سکت نہیں رکھتی اس کی آسان سی مثال وہ روایت ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گدھوں کو ذبح کر کے پکانے کی غرض سے ان کا گوشت ہانڈیوں میں ڈالا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو کھانے سے منع فرمایا اور سب ہانڈیوں کو انڈیل دیا گیا اس کے جواب میں یہ کہنا کہ (نعوذ باللہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فطرت بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ تھی انتہائی نازیبا اور نہایت گستاخی کی بات ہو گی مع ھذا اس سے جناب غامدی صاحب کو فائدہ بھی نہیں پہنچے گا کیونکہ جب صحابہ کرام کی فطرت محفوظ نہیں تو پھر امت میں سے کس کی فطرت اور سلامتی طبع محفوظ رہ سکتی ہے؟

اور جہاں تک گھوڑے کے گوشت کا تعلق ہے تو اس کے کھانے کو اور دستر خوان پر رکھنے کو خلاف فطرت قرار دینا صحیح احادیث کے خلاف ہے چنانچہ ترمذی شریف میں صحیح حدیث ہے۔

عن جابر قال اطعمنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لحوم الخیل و نھانا عن لحوم الحمر''(ترمذی جلد دوم ص ا باب ۵)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں گھوڑوں کا گوشت کھلایا اور گدھوں کا گوشت کھانے سے ہم کو منع فرمایا ہے۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت اسماء رضی اللہ عنھا سے روایت ہے فرماتی ہیں۔

"ذبحنا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم فرسا ونحن بالمدینۃ فاکلناہ"

"ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک گھوڑا ذبح کیا تھا جبکہ ہم مدینہ میں تھے سو ہم نے اسے کھالیا تھا"

اور یہی جمہور علماء یعنی شافعیہ، حنابلہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور بہت سے صحابہ کرام و تابعین کا مذہب ہے کہ گھوڑے کا گوشت بغیر کسی کراہیت کے حلال ہے تاہم امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا نقطۂ نظر اس بارے میں جمہور سے مختلف ہے مگر وہ بھی صرف کراہیت کے قائل ہیں اور ترجمان حنفیہ حضرت شاہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے "عرف شذی" میں کراہیت تنزیہی کو مختار کہا ہے بلکہ در مختار نے تو امام صاحب سے مرض وفات میں اپنے قول سے رجوع نقل کیا ہے۔

بہر حال حنفیہ جو گھوڑے کو مکروہ قرار دیتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ فطرت کے خلاف ہے بلکہ آلۂ جہاد ہونے کی وجہ سے کہ اگر اس کے کھانے کی اجازت دی جائے تو جہاد کے اسباب پر منفی اثر پڑے گا، اس طرح جہاد کا عمل تسلسل سے جاری نہیں رہ سکے گا، لہذا نہ معلوم کہ جناب غامدی صاحب کس فطرت کے تناظر میں فرمارہے ہیں کہ: وہ (انسان) جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے دستر خوان کی لذت کے لئے نہیں سواری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

جناب غامدی صاحب اسی اصول کی ایک اور مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سورۃ مائدہ کی آیات ۳۳۔۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے فساد فی الارض کے مجرموں کی یہ سزا بیان کی ہے کہ انہیں بدترین طریقے سے قتل بھی کیا جاسکتا ہے، سولی بھی دی جاسکتی ہے، ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے بھی جاسکتے ہیں اور انہیں جلاوطن بھی کیا جاسکتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکم کا اطلاق اپنے زمانے میں زنا کے بعض عادی مجرموں پر کیا (اصول و مبادی ص ۴۷)

المسترشد:۔ جناب غامدی صاحب اور ان کے استاذ جناب امین احسن اصلاحی اور جناب حمید الدین فراہی نے زانی کی سزا کو اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اگر زانی عادی زناکار ہے اور آوارہ منشی اور جنسی بے راہ روی کو اپنا معمول بنا چکا ہے تو وہ باغی کے حکم کے تحت قتل اور رجم کئے جانے کا مستحق ہے جبکہ غیر عادی زانی کی سزا اس سے نرم ہے جو سو کوڑوں کی شکل میں اور جلاوطنی کی صورت میں دی جائیگی چنانچہ وہ اپنی ایک اور کتاب ''حدود و تعزیرات'' میں ص ۱۳۲ پر عنوان تقتیل کے تحت لکھتے ہیں: آیت میں اس سزا کے لئے ''ان یقتلوا'' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ محاربہ اور فساد فی الارض کے یہ مجرم صرف قتل ہی نہیں بلکہ عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیئے جائیں...... آگے لکھتے ہیں...... رجم یعنی سنگ ساری بھی ہمارے نزدیک اسی کے تحت داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے میں اوباشی کے بعض مجرموں کو یہ سزا اس آیت کے حکم کی پیروی میں دی ہے اور ایک کتاب ''برُھان'''' میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث جو سو سے زائد صفحوں پر مشتمل ہے، کا رُخ فقہائے کرام کی غلطی

ثابت کرنے اور حضرت ماعزاسلمی رضی اللہ عنہ کی آوارہ گردی اور عادی زانی کے اثبات کی جانب موڑ کرایڑی چوٹی کازور لگایاہے۔

عوام الناس کو سمجھنے کی سہولت دینے کے پیش نظر اس موقع پر نفس مسئلہ کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

فقہائے کرام اور چاروں مذاہب کے آئمہ عظام فرماتے ہیں کہ زنا کا مرتکب خواہ وہ عورت ہو یامرد اگر شادی شدہ ہو تو جرم ثابت ہونے پر اس کی سزارجم یعنی سنگ ساری ہے جبکہ غیر شادی شدہ کی حدو سزا سو کوڑے تو ہیں ہی تاہم اس کے ساتھ اسے شہر بدر بھی کیاجائے گا یانہیں تواس میں دورائے ہیں۔ یہ بات انہوں نے سورۃ مائدہ اور سورۃ نور کی آیات اور مسلم شریف وغیرہ کی حدیث کی روشنی میں کی ہے جس میں ہے "البکر بالبکر جِلْدُ مائة و نفی سنة، و الثیب بالثیب جِلْدُ مائة و الرجم" یعنی کنواروں کے زنا پر سو کوڑوں کی سزااور شہر بدر کرنا ہے جبکہ شادی شد گان کے زنا کی سزا سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث مبار کہ وارد ہوئی ہیں مگر اختصار کے پیش نظر اسی ایک حدیث پر اکتفا کیا گیاچونکہ ہمیں یہاں پر جلاوطنی کی سزا سے بحث کرنا نہیں ہے اس لئے اس حدیث کی شرح کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے، بہرحال اس حدیث میں دونوں سزاؤں کے درمیان حد فاصل واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ اگر وہ شادی شدہ ہو تو سنگ ساری کا مستحق ہے ورنہ اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ یہ بات جس تقابلی انداز سے کی گئی ہے اس کا یہ مطلب عام آدمی بھی بآسانی سمجھ جاتا ہے اور اس بارے میں اسے کسی

قسم کا ابہام نظر نہیں آتا ہے کیونکہ ہر کس و ناکس سمجھتا ہے کہ اگر چند لوگ چوری کرتے ہوئے گرفتار ہو جائیں اور پھر جیل حکام کی جانب سے یہ اعلان ہو جائے کہ۔

''کنوارے اور رنڈوے الگ الگ ہو جائیں'' تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ علیحد گی شادی شدہ ہونے اور نہ ہونے کی بناپر کی گئی نہ کہ پیشہ ور چور یا عادی مجرم اور ایک آدھ دفعہ چوری کرنے کی بناپر،،

اور اصولی اعتبار سے بھی یہ بات سو فیصد صحیح ہے کیونکہ جب کسی اسم مشتق پر حکم لگتا ہے تو اس کی علت اس کا مبدا اور ماخذ اشتقاق ہوتا ہے یعنی جو لفظ کسی وصف سے لیا گیا ہو تو جب اس پر حکم لگادیا جاتا ہے تو اس کا دار و مدار اسی وصف پر ہوتا ہے یہ بات تمام اہل علم میں متفقہ ہے مثلاً جب یوں کہا جائے کہ ''علماء کی قدر کرو'' اور ''قانون نافذ کرنے والوں کی بات مانو'' تو ہر ذی شعور یہی سمجھتا ہے کہ علماء کی قدر دانی کی وجہ ان کا علم اور قانون نافذ کرنے والوں کی فرمانبرداری کی علت ان کی قانونی حیثیت اور منصب ہے، لہذا اس مندرجہ بالا حدیث میں کنوارے کی سزا سو کوڑے اور شادی شدہ کی سزا رجم مقرر کرنا عادی و غیر عادی کی بناپر نہیں بلکہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ عام آدمی بھی اس کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا چہ جائے کہ کوئی فقیہ اس میں تامل کرے۔

اور عقلی طور سے بھی یہ بات وزنی لگتی ہے کہ غیر شادی شدہ شخص اگرچہ اس بھوکے شخص کی مانند تو نہیں جس کے سامنے دو ہی راستے ہوں موت یا حرام خوری اس لئے کوئی بھی زانی اپنے اس قبیح عمل میں کبھی بھی معذور نہیں سمجھا گیا

ہے اور شرعاً اسے کسی بھی حالت میں زنا کی اجازت و رخصت نہیں دی گئی ہے تاہم اس میں اور شادی شدہ میں ایک گونہ فرق پایا جاتا ہے کہ شادی شدہ اپنے اندر پانے والی شہوانی بے چینی کو جائز طریقے سے بہ آسانی دور کر سکتا ہے اگر وہ اس حلال طریقے کو چھوڑ کر کوئی ناجائز راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کی مثال اس درندے کی سی ہو گی جس کے سامنے بہت سارا کھانے کے قابل گوشت پڑا ہو مگر وہ جب کسی کمزور جانور کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک ہیجانی کیفیت جنم لینے لگتی ہے چنانچہ وہ مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے اور یہ پرواہ کئے بغیر کہ دوسروں کی جان بھی محفوظ ہونی چاہئے اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال اس درندہ صفت آدمی کی طرح ہے جو اپنی زندگی کو پُر تعیش بنانے کی خاطر لوگوں کا مال لوٹتا اور جانیں لیتا ہے، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا کرنے والا ہر شخص خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ سخت سزا کا مستحق ہے تاہم اُس آدمی کا درجہ نسبتاً کم مجرمانہ ہے جس کی مثال اس توانا جوان جیسی ہو جو محنت مزدوری نہیں کرتا اور جب اسے بھوک لگتی ہے تو وہ دوسروں کے مال چوری کرکے یا ڈاکہ ڈالکر چھین لیتا ہے، یقیناً وہ اپنے اس عمل سے اور اپنے حقیر فائدے کی خاطر دوسروں کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے اس کی تمامتر ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے اور کوئی صاحب عقل اس کو معذور نہیں سمجھتا مگر جب اس کا موازنہ پہلے شخص سے کیا جاتا ہے تو دونوں کے جرم میں بذات خود تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی اشتعال میں آکر دوسرے کو قتل کرتا ہے اور دوسرا بلا اشتعال کسی کی جان تلف کرتا ہے تو جرم کے حوالے سے دونوں مجرم ہیں مگر دونوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ بلا اشتعال قتل کی صورت میں قاتل کی عقل نارمل ہونے

کے باوجود جرم کی مرتکب ہوتی ہے جبکہ اشتعال کی صورت میں قاتل کی عقل نیم پاگل ہو جاتی ہے اور اسی نکتہ کے پیش نظر آج کل وکلاء برادری اشتعال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قاتل کو جان کا تحفظ فراہم کرواتی ہے۔ گویا اس صورت میں اہل دانش کی دو رائے ہیں کہ اشتعال اور بلا اشتعال میں فرق ہے یا نہیں؟ چونکہ انسانی جان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اس شبہے کے پیش نظر غیر شادی شدہ زانی کی سزا قتل نہیں بلکہ کوڑوں کی شکل میں مقرر کی گئی۔

جناب **غامدی صاحب** اور ان کے بعض اساتذہ کی منطق اس بارے میں وہی ہے جو گزشتہ صفحات پر بحث کے آغاز میں بیان کی گئی کہ سنگ ساری کا تعلق ''احصان'' یعنی شادی شدہ ہونے سے نہیں بلکہ عادی زانی ہونے سے ہے یہ سزا ان کے مطابق فساد فی الارض اور محاربہ کے جرم کی بنا پر دی جاتی ہے۔

اس اختلاف کی بنیادی وجہ وہی اختلاف ہے کہ آیا حدیث سے قرآن کی تخصیص و تحدید ہو سکتی ہے یا نہیں جس کی تفصیل پچھلے صفحات پر گزر چکی ہے۔

چونکہ رجم صحیح احادیث سے ثابت ہے اس کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارا نہیں دوسری جانب ''دبستان شبلی'' کے نزدیک سنت سے قرآن کریم کی کسی طرح تحدید و تخصیص جائز نہیں اس لئے ان لوگوں نے رجم کو محاربہ کی آیت کے ضمن میں ڈال کر یہ موقف اپنایا کہ دراصل سزائے رجم پانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو عادی زانی ہو اور ہر عادی زانی معاشرے کے لئے ناسور اور مفسد ہوتا ہے لہذا اس کی سزا تقتیل ہی ہو گی جو رجم و سنگ باری کی صورت میں دی جائے گی۔

نتیجہ کے اعتبار سے اگرچہ دونوں فریقین رجم کے قائل ہیں تاہم غامدی والوں کے موقف سے دوسری خرابیوں کے علاوہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ

کا عادی زانی ہونا لازم آتا ہے جبکہ فقہائے کرام کی تحقیق سے کسی قسم کی کوئی خرابی کا احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ دبستان شبلی کی ایک خصلت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا ایک معیار مقرر کرکے دلائل و نصوص کو اس کے تابع و مواقف بنانے کی کوشش کرتے ہیں اگر کوئی روایت اس سے میل نہیں رکھتی تو اس کو ردی کے ٹوکرے میں بلا تکلف ڈال دیتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کا جو مقام قرآن و حدیث اور تاریخ سے معلوم ہوا ہے اور امت کے سینوں میں جو قدر ان ہستیوں کی موجزن ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت اور ناقابل انکار امر ہے مگر جناب غامدی صاحب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو عادی زانی ثابت کرنے پر اوراق در اوراق بھرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اعتراف جرم اور ندامت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ کوئی مرد صالح تھا جس سے یہ جرم اتفاقاً سرزد ہو گیا دنیا میں جرائم کی جو تاریخ اب تک رقم ہوئی ہے۔ اس سے دسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ بدترین اوباش اور انتہائی بدخصلت گندے جو کسی طرح گرفت میں نہیں آسکتے تھے کسی وقت ارتکاب جرم کے فوراً بعد اس طرح قانون کے سامنے خود پیش ہوئے کہ ان کی ندامت پر لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے'' (برہان ص ۸۳ جون 2006 المورد)

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو عادی زانی ثابت کرنے کے لئے ان حضرات نے جو دلیل پیش کی ہے وہ مسلم کی ایک روایت پر مبنی ہے چنانچہ غامدی صاحب برہان میں لکھتے ہیں۔

''یہ کس قسم کا مجرم تھا؟ اس سوال کا نہایت واضح جواب اس تقریر میں موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے رجم کی سزا دینے کے بعد اسی دن عصر کے وقت کی............امام مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''او کلما انطلقنا غزاۃ فی سبیل اللہ تخلف رجل فی عیالنا، لہ نبیب کنبیب التیس، عَلٰی ان لا اوتی برجل فعل ذالک الا نکلت بہ''

''کیا یہی نہیں ہوا کہ جب کبھی ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے تو ہمارے اہل و عیال میں سے ایک شخص پیچھے رہ گیا جو شہوت کے جوش میں بکرے کی طرح بلبلاتا تھا؟ سنو! مجھ پر لازم ہے کہ اس طرح کا کوئی مجرم اگر میرے پاس لایا جائے تو میں اسے عبرت ناک سزا دوں''(برہان ص ۸۱)

جناب غامدی صاحب نے اس موقع پر انشا پردازانہ قلم چلایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک مورخ اور انشا پرداز میں بڑا فرق ہوتا ہے مورخ تاریخی واقعات اور ان کے اسباب کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے ایک نقاش کسی چیز کی پوری تصویر ہو بہو کھینچتا ہے جبکہ انشا پرداز تاریخی وقائع میں اپنی غرض و مطلب کی چیز نمایاں کر کے پیش کرتا ہے جیسے تصویر بنانے والا بعض خاص خاص مواضع کو نمایاں طور پر بناتا ہے۔ غامدی صاحب نے ''برہان'' میں صحابہ کرامؓ کے زرین دور کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جس کی ایک جھلک اوپر دکھائی گئی اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب جہاد کیلئے تشریف لے جاتے تو پیچھے رہ جانے والی عورتوں کی مثال گویا بھیڑ بکریوں کی مانند ہوتی والعیاذ باللہ، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ وہ خیر القرون کا زمانہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود میمون کی وجہ سے انتہائی مبارک دور تھا، دوسری جانب

عرب زنا کے عار سے بچنے کے لئے اپنی بچیوں کو زندہ در گور کرنا تو گوارا کرتے مگر اس عار کا سامنا برداشت نہیں کرتے، عرب دنیا کی واحد قوم ہے جو نسب اور نسل کا انتہائی اہتمام کرتی ہے وہ نسب کے تحفظ کی خاطر خود تو مٹنا پسند کرتے ہیں مگر نسب کا اختلاط برداشت نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ عربوں کے انساب آج بھی باقی و محفوظ اور قابل اعتبار ہیں جبکہ عجمیوں (غیر عرب) میں اس کی رعایت ضروری نہیں۔

غامدی صاحب اس امر سے صرف نظر کر چکے کہ حضور علیہ السلام وہ مرشد تھے جن کے ہاتھ پر ایک دفعہ بیعت کرنے والے کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ور آپ ﷺ کی ایک نظر سے ایک کم تر اور نکمہ آدمی بھی زہد و تقویٰ اور ورع کے افق پر نمودار ہونے والا چمکتا ہوا ستارہ بن جاتا، ٹھیک ہے کہ انبیاء علیھم السلام کے سوا معصوم کوئی نہیں لیکن اگر امت میں ان لوگوں کی فہرست بنائی جائے جو گناہوں سے محفوظ رہ چکے ہیں تو تمام ادوار میں پہلے نمبر پر صحابہ کرام کا دور آتا ہے' گناہوں پر اصرار اور کبائر کا بار بار ارتکاب ان کی شان سے بہت بعید ہے بلکہ تقریباً ناممکن ہے پھر یہ مسئلہ صرف گناہ ہی کا نہیں بلکہ غیرت کے خلاف ہے جو کسی بھی مہذب معاشرے کے منافی ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے جس کے مطابق حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ مرتبہ زنا کرنے کا اقرار کیا ہو یا ان پر بَمُوجَبِ شہادت ثابت ہوا ہو، غامدی صاحب زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں لفظ ''کلما'' اور بکرے کے ساتھ تشبیہ سے ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ ان کا معمول تھا۔

ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں تک تشبیہ کا تعلق ہے تو یہ کنایہ ہے اس عمل سے اور عربی زبان میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ جب کوئی عمل قبیح ہو تو اسے صریح الفاظ میں ادا کرنے کے بجائے کنایات اور اشارات میں تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً چھوٹے بڑے پیشاب سے فراغت کے لئے قضائے حاجت وغیرہ کے الفاظ اور جہاں یہ کام ہوتا ہے اس کے لئے بیت الخلاء وغیرہ کے درجن بھر الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں قرآن کریم میں میاں بیوی کے ازدواجی حیثیت سے ملاپ کو ایک آیت میں یوں تعبیر کیا ہے۔

"فلماتَغَشّٰھَا" پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا(اعراف آیت۱۸۹)

پھر بلاغت کی کتابوں میں تصریح کی گئی ہے کہ تشبیہ میں تمام جہات مراد نہیں ہوتی ہیں بلکہ کسی مرکب چیز میں سے بعض وجوہ بھی مراد ہو سکتی ہیں، لہذا یہاں تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے بکرا اپنی خواہش پوری کرنے کیلئے حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتا اسی طرح بعض لوگ بھی یہ فرق نہیں کرتے۔

اگر اس حدیث کا وہ مطلب لیا جائے جو غامدی صاحب نے متعین کیا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قبیح عمل کا پہلے سے علم تھا مگر آپ ﷺ اس پر خاموش تھے کیونکہ جب حضرت ماعز ؓ کے اقرار میں تکرار عمل اور بار بار دہرانے کا کوئی اشارہ نہیں اور پھر بھی بقول غامدی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا عادی ہونا اپنے خطبے میں بیان فرمارہے ہیں تو یقیناً آپ ؐ کو معلوم ہوگا، پھر غامدی صاحب کو اس کا جواب بھی دینا ہوگا کہ آنحضور علیہ السلام حضرت ماعز کی اس مجرمانہ حرکت پر کیوں خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے؟

رہا لفظ ''کلما'' کا تقاضا تو اس سے استدلال تب درست ہوتا جب یہ بیان واقعہ کیلئے مخصوص ہوتا حالانکہ یہاں بیان ضابطہ کیلئے کلام میں شامل کیا گیا ہے اور ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کوئی سبب رونما ہوا پھر اس پر ایک عام حکم نازل ہوا جو پوری امت کیلئے ضابطہ اور قانون ہوتا ہے ایسے واقعہ کو اصطلاح میں شان نزول اور سبب نزول یا شان ورود اور سبب ورود کہا جاتا ہے۔ یہ وہی صورت ہے جس کے متعلق مفسرین و فقہاء لکھتے ہیں ''**العبرة لعموم الالفاظ دون خصوص المورد**'' اعتبار لفظ کے عموم کا کیا جائے گا نہ کہ خاص شان نزول کا۔ یہ بات پہلے بھی عرض کی جاچکی ہے۔

جس طرح قرآن کی بعض آیتیں، بعض دوسری آیات کی تفسیر کرتی ہیں اسی طرح احادیث مبار کہ بھی ایک دوسرے کی تفسیر اور شارح بنتی ہیں مسلم ہی کی دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبے میں بجائے ''کلما'' کے **فما بال اقوام اذا غزونا الخ** کے الفاظ ہیں چونکہ یہ خطبہ ایک ہی تھا اس لئے بلاشبہہ ماننا پڑے گا کہ ان روایات میں بعض روایت بالمعنی کے طور پر مروی ہیں پس ہم جس روایت کو بھی روایت بالمعنی پر محمول کریں گے اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ راوی اس خطبہ سے یہی سمجھے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں عام ضابطہ بیان فرمایا ہے کیونکہ لفظ ''اقوام'' جمع کا صیغہ ہے جو کسی شخص واحد پر فٹ نہیں آتا بالخصوص جناب غامدی صاحب کے ہاں تو الفاظ سے معروف معنی ہی مراد ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ اس خطبہ میں حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا مکرر عمل ثابت کرنا، یا بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس عمل کی تکرار پر سزا کی تکرار مرتب کرنا چاہتے ہیں یعنی جو بھی شخص

شادی شدہ ہونے کے باوجود اس عمل قبیح کا ارتکاب کریگا تو جرم ثابت ہونے پر اس کی سزا یہی ہو گی۔

جناب غامدی صاحب کتاب کے اخیر میں لکھتے ہیں۔

''تیسری چیز یہ ہے کہ حدیث میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کے موقع و محل کو سمجھ کر اس کا مدعا متعین کیا جائے۔بات کس وقت کی گئی، کس سلسلہ میں کی گئی اور کن لوگوں سے کی گئی، یہ سب چیزیں اگر ملحوظ نہ رکھی جائیں تو نہایت واضح باتیں بھی بسا اوقات لاینحل معما بن جاتی ہیں۔ فہم حدیث میں اس اصول کی اہمیت غیر معمولی ہے ''الائمۃ من قریش'' مشہور روایت ہے اس حدیث کے ظاہر الفاظ سے ہمارے علما اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ مسلمانوں کے حکمران صرف قریش میں سے ہوں گے۔ دراں حالیکہ یہ بات مان لی جائے تو اسلام اور برہمنیت میں کم سے کم سیاسی نظام کی حد تک کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔اس مغالطے کی وجہ محض یہ ہوئی کہ ایک بات جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد سیاسی صورت حال کے لحاظ سے کہی گئی تھی اسے دین کا مستقل حکم سمجھ لیا گیا''(اصول ومبادی ص ۸۲)

المسترشد:۔غامدی صاحب نے یہ اصول جناب مودودی صاحب سے لیا ہے جو اس بات کے قائل تھے کہ اسلام کے اصول مصلحت کے پیش نظر، وقت اور حالات کے مطابق بدل جاتے ہیں چنانچہ وہ رسالہ ''منبر''۱۹۵۸ء میں لکھتے ہیں۔

''اصول اسلام دو قسم کے ہیں ایک وہ ہے جس میں کسی قسم کی تغییر و تبدیلی نہیں ہو سکتی جیسے توحید اور رسالت، اور دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی مصلحت کی وجہ سے تبدیلی ہو سکتی ہے پھر اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو''

یہ اصول دین کا ایک قاعدہ ہے کہ افراد اور قبائل باہم مساوی ہیں اور اس میں قبائلی اور نسب کے عنصری تفرقہ کا خاتمہ کر دیا کہ باہم عزت و فضیلت، تقویٰ کی بنیاد پر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور حضور علیہ السلام نے اس پر عمل کیا اور حضور ﷺ نے بار بار اس کا اعلان فرمایا اور غلاموں کو امارت کے مناصب پر فائز فرما کر اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اور اسی نظام کے قیام کے لئے بہت کوشش کی۔ لیکن جب نظام مملکت کے قیام کا وقت آیا تو بہت جلد اس بنیادی اصول کو ترک کر دیا اور فرمایا ''آئمہ (امیر) قریشی ہوں گے۔

اس اصول پر تبصرہ کرتے ہوئے محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوری صاحبؒ فرماتے ہیں۔

''یہ انتہائی غلط سوچ اور نظریہ ہے جو انتہائی گمراہی اور کج روی کو پہنچا ہوا ہے، جس کو تردید و تنقید سے کسی قسم کی کوئی تاویل نہیں بچا سکتی کیونکہ اس کی برائی و شناعت صبح روشن کی طرح ایسی عیاں ہو چکی ہے جس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ہر عبادت و دین جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ حج وغیرہ اگرچہ اسلام کے بنیادی مقاصد ہیں لیکن نظام مملکت کی مصلحتوں کے تقاضے کے تحت اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا، اور جناب نے اس کا نام ''حکمت عملی'' رکھا جو اصول دین کی ہر چیز میں دخل اندازی کرے گی، غور فرمایئے کیا آپ نے اس

طرح صریح گمراہی اور بھیانک کج روی دیکھی ہے؟ مودودی صاحب جماعت اسلامی کے نظام میں اس من گھڑت اصول پر عمل پیرا ہیں۔

جس وقت پاکستان میں انتخابات کیلئے امیدوار نامزد ہو رہے تھے، تو محترمہ فاطمہ جناح، جناب ایوب خان کے مقابلے میں کھڑی ہوئیں تو مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے اللہ کی دی ہوئی تمام طاقت و قوت کو لیکر فاطمہ جناح کی حمایت میں جان کی بازی لگائی اور دعویٰ کیا کہ حکمرانی کی تمام صفات محترمہ میں موجود ہیں اور ایوب خان سب سے محروم ہیں اور محترمہ حکمران بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں تو اس پر علماء اور عوام نے اعتراض کیا کہ اصول اسلام کی رو سے عورت حکمران نہیں بن سکتی اور محترمہ کا حکمران بننا ممکن نہیں تو مودودی صاحب نے اسی بنیادی قاعدہ کو مضبوطی سے تھامے رکھا آج ان کی جماعت کا مدار بھی اسی قاعدے پر ہے کہ یہ ضابطہ اسلام کے ان اصول میں ہے جس میں تغیر و تبدیلی ہو سکتی ہے اور یہ توحید و رسالت کی طرح نہیں (کہ جس میں تغیر و تبدیلی نہ ہو سکے)

چنانچہ ان کے اس عقیدے پر بہت ہنگامہ ہوا، اخبارات و رسائل، جلسوں اور کانفرنسوں میں اس پر بڑی وسیع بحثیں ہوئیں اور ہر مجلس اور وادی میں اس کا چرچا ہونے لگا ان کے اسی نظریہ کی وجہ سے جناب امین احسن اصلاحی نے ۱۹۵۷ء میں استعفیٰ دیا جو شروع ہی سے ان کا حامی تھا اور اسی شخص نے ان کی جماعت کی پشت مضبوط کی تھی اور اس نے ان کے بہت سے نظریات کو آراستہ اور جاذب بنایا تھا اور ہر ممکن مدافعت کی تھی، اس کے باوجود اس نظریہ کے بعد وہ ان کے ساتھ رہنے کے متحمل نہ ہو سکے اور ان کیلئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس تلخ گھونٹ

کو حلق میں اتار سکے اور اس میں کوئی گنجائش پیدا کر سکے، چنانچہ انہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ان سے کنارہ کشی اختیار کی کہ میں نے اپنی قوت و جوانی براعت و ہمت اس گمراہ شخص کے ساتھ ضائع کی (مودودی صاحب کی حیات وافکار ص ۳۲ تا ص ۱۳۵ المکتبۃ البنوریہ)

جناب غامدی صاحب کے اس اصول پر علامہ بنوری صاحب کا تبصرہ جامع اور کافی ہے اس پر مزید کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ تاہم جناب غامدی صاحب کی خدمت میں اتنی سی گزارش ہے کہ یہ وہی اصول ہے جس کی بنا پر آپ کے استاذ، جناب مودودی صاحب پر برہم و ناراض ہو کر ان کی جماعت سے حسرت کے اظہار کے ساتھ مستعفی ہوئے، اگر آپ اس اصول کو بنیاد بنا کر علمائے امت کو غلط قرار دیتے ہیں تو آپ کے استاذ نے اس صحیح اصول کو کیوں نہ مانا؟

راقم پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ ''دبستان شبلی'' کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنے اصول کو وقت اور مصلحت پر قربان کر دیتے ہیں جناب شبلی نعمانی رحمہ اللہ کے زمانہ میں جب حالات جہاد کیلئے ناموافق تھے تو انہوں نے تاویلات کا باب کھولا، پھر جب جناب مودودی صاحب کے دور میں حالات درست ہوئے تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ جہاد کو اپنا مشن بنایا بلکہ پورا دین جہاد کا مقدمہ اور مشق قرار دیتے ہوئے صریح الفاظ میں نماز، روزہ، اور زکوٰۃ وغیرہ کو جہاد کی تیاری اور ٹرینگ ثابت کرنے پر اپنی قوت خرچ کر دی۔

اب جبکہ حالات پھر نامساعد ہو گئے تو جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں ''مسلمانوں کے لئے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے، اس کے سوا کسی مقصد کے لئے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی'' (قانون جہاد ص ۴۰ نومبر 2006)

ان لوگوں سے ہماری درخواست ہے کہ خدارا دین کو گندم کا آٹا نہ سمجھیں کہ اپنی مرضی و خواہش کے مطابق اس سے جو بنانا چاہیں بنا دیں۔ **وھذا آخر بعض ماادرناہ واللہ الموفق والیہ المرجع والمآب وصلی اللہ علی حبیبہ محمدوعلی آلہواصحابہواتباعہاجمعین**

حضرت مولانا مفتی کمال الدین المسترشد مدظلہ

کی دیگر تصانیف

- تشریحات ترمذی — ۵ جلد
- نقش قدم — کامل
- الزاد الیسیر فی علوم التفسیر
- راہ معرفت
- شعاعی تصویر کی حقیقت اور شرعی حیثیت
- قیاس اور تقلید کی حقیقت اور شرعی حیثیت
- الصیحۃ الاولیٰ

Desined & Printed By: Shafaq Printing press 0321-2037721